پندرہ روزہ

تعمیرِ حیات

لکھنؤ

ندوۃ العلماء کا مسلک

دین و عقائد کے معاملہ میں ندوۃ العلماء کے مسلک کی بنیاد دین خالص پر ہے جو ہر قسم کی آمیزش اور آلائش سے پاک، تاویل اور تحریف سے بلند، ملاوٹ اور فریب کی دسترس سے دُور اور ہر اعتبار سے مکمل اور محفوظ ہے۔

دین کے فہم اور اسکی تشریح اور تعبیر میں اسکی بنیاد اسلام کے اولین اور صاف وشفاف سرچشموں سے استفادہ اور اس کے صحیح اور اصل کی طرف رجوع پر ہے۔

اعمال و اخلاق کے شعبہ میں دین کے جوہر و مغز کو اختیار کرنے، اس پر مضبوطی سے قائم رہنے، احکام شرعیہ پر عمل، حقیقتِ دین اور روحِ دین سے زیادہ سے زیادہ قربت اور تقویٰ اور صلاحِ باطن پر ہے۔

تصورِ تاریخ میں اس کی بنیاد اس پر ہے کہ اسلام کے ظہور اور عروج کا دورِ اول سب سے بہتر اور قابل احترام دور اور وہ نسل جس نے آغوشِ نبوت اور درسگاہ رسالت میں تربیت پائی اور قرآن و ایمان کے مدرسہ سے تیار ہو کر نکلی سب سے زیادہ مثالی اور قابل تقلید نسل ہے، اور ہماری سعادت و نجات اور فلاح و کامرانی اس بات پر منحصر ہے کہ ہم زیادہ سے زیادہ اس سے استفادہ کریں اور اس کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کریں۔

نظریۂ علم اور فلسفۂ تعلیم میں اس کی اساس اس پر ہے کہ علم بذات خود ایک اکائی ہے جو قدیم و جدید اور مشرق و مغرب کے خانوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتی۔ اگر اس کی کوئی تقسیم ممکن ہے تو وہ تقسیم صحیح اور غلط، مفید اور مضر اور ذرائع اور مقاصد کے اعتبار سے ہوگی۔

استفادہ و افادہ اور ترک و قبول کے شعبہ میں اسکا عمل اس حکیمانہ نبوی تعلیم پر ہے کہ "حکمت مومن کا گم شدہ مال ہے جہاں بھی وہ اس کو پائے وہ اس کا سب سے زیادہ مستحق ہے" نیز قدیم حکیمانہ اصول "خذ ما صفا ودع ما کدر" پر (یعنی جو صاف و نظیف ہو اس کو لے لو جو آلودہ و کثیف ہو اس کو چھوڑ دو)۔

اسلام کے دفاع اور عصر حاضر کی لادینی قوتوں کے مقابلہ میں اس کی اساس اس ارشادِ ربانی پر ہے،

"واعدوا لهم ما استطعتم من قوة الآية (قرآن مجید) (ان کے مقابلہ کے لئے جتنی قوت تم سے ممکن ہو سکے تیار کرو)

دعوت الی اللہ، اسلام کے محاسن و فضائل کی تشریح اور ذہن و عقل کو اسکی حقانیت و صداقت پر مطمئن کرنے میں اس کا عمل اس حکیمانہ وصیت پر ہے،

"کلموا الناس علی قدر عقولهم، أتريدون أن يكذب الله و رسوله" (وصیت حضرت علی کرم اللہ وجہہ) (لوگوں سے ان کی عقلوں کا خیال رکھتے ہوئے گفتگو کرو، کیا تم چاہتے ہو کہ خدا اور رسول کو جھٹلا دیا جائے!)

فروعی و فقہی مسائل کے بارے میں اس کا مسلک و اصول یہ ہے کہ حتی الامکان اختلافی مسائل کو چھیڑنے، اور ہر ایسے طرزِ عمل سے احتراز کیا جائے جس سے باہمی منافرت بڑھے اور امت کا شیرازہ منتشر ہو، سلف صالحین سے حسن ظن رکھا جائے اور ان کے لئے عذر تلاش کیا جائے، اسلام کی مصلحت اجتماعی کو ہر مصلحت پر ترجیح دی جائے۔

مختصراً یہ کہ وہ حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی (م ۱۱۷۶ھ) کے علمی و فکری اور کلامی و فقہی مدرسۂ فکر سے زیادہ قریب اور ہم آہنگ ہے۔

اس لحاظ سے ندوۃ العلماء ایک تعلیمی مرکز سے زیادہ (جس کا وظیفہ صرف درس و تدریس، مختلف علوم اور زبانوں کی خدمت اور میراثِ علم کو ایک نسل سے دوسری نسل اور ایک طبقہ سے دوسرے طبقہ کی طرف منتقل کرنا ہوتا ہے) ایک جامع اور کثیر المقاصد دبستانِ فکر اور مکتبِ خیال ہے۔

(مولانا) سید ابو الحسن علی ندوی

ناظم ندوۃ العلماء

Regd. No. L 1981 FORTNIGHTLY Phone : 22948

TAMEER-E-HAYAT

Darululoom Nadwatululama. Lucknow (India)

A few English works of Maulana Abul Hasan Ali Nadwi.

Islam and the World : *by S. Abul Hasan Ali Nadwi, translated by Dr. M. Asif Kidwai, pp. 210, price Rs. 18/-*

"ISLAM AND THE WORLD belongs to the small class of thoughtful and thought provoking books which inquires into the factors responsible for the rise and decline of Muslims, studies the impact of Islam on the world and intelligently discusses the role of Islam in the world of today and tomorrow. Maulana Nadwi's book provides a rational and historical refutation of the charge often made from several quarters that it is Islam which is responsible for the present backwardness of the Muslims."

ISLAMIC REVIEW
London, November-December, 1961

Western Civilization—Islam and Muslims : *by S. Abul Hasan Ali Nadwi, translated by Dr. M. Asif Kidwai, pp. 199, price Rs. 22/- :*

"This book is a whiff of fresh air in the midst of communal madness all round ...... It will be serving a great purpose if it can make the Muslim countries, especially the Indian Muslims to some furious thinking in order to extricate themselves from the malaise in which they have been pushed by their static policies and programmes."

THE HINDUSTAN TIMES
Delhi, December 21, 1969

Muslims in India : *by S. Abul Hasan Ali Nadwi, translated by Dr. M. Asif Kidwai, pp. 155, price Rs. 7.00 :*

"After Hunter's MUSALMANS OF INDIA this book may be said to be most useful publication on the subject ......

The author "gives a detailed exposition of the achievements of the Muslim scholars in our country and their contribution to the freedom struggle. He demonstrates clearly that in contributing to the classical literature of Arabic and Persian, the Indian Muslims have to their credit a unique achievement, unique in the annals of world literature. By emphasising this aspect the Maulana has given a fitting answer to those historians who consider the period of Islamic domination as a dark age in the history of this sub-continent."

THE STATESMAN
Delhi, December 22, 1963

Religion and Civilization : *by S. Abul Hasan Ali Nadwi, translated by Mohiuddin Ahmad, pp. 120, price Rs. 8/-. :*

"This brief but incisive work comprises the lectures delivered some years ago at the Jamia Millia, Delhi, and deals with the essential questions of eschatology, cosmology and the resultant socio-ethical order. Like Sorokin, he classifies cultures into sensate and idealistic but unlike him develops his own formulation of the revelatory culture, articulated par excellence, in the Islamic faith and culture ...... One gets from this book a broad and overall view of the socio-ethical order based on revealed guidance."

IMPACT INTERNATIONAL
London, May 16, 1971

Saviours of Islamic Spirit : *Vol. I, by S. Abul Hasan Ali Nadwi, translated by Mohiuddin Ahmad, pp. 434, price Rs. 28/- : Vol. II, Price Rs. 35.*

"Syed Abul Hasan Ali Nadwi has rendered a great service not only to Muslim readers but also to the non-Muslims by placing before them the saintly and devout lives of some of the most eminent men not only of Islam but of the world ...... One wishes more books like this will come out so as to bring out those aspects of Islam which are not as well known as they ought to be."

NATIONAL HERALD
Lucknow and Delhi. 9th July, 1972

The Four Pillars of Islam : *by S. Abul Hasan Ali Nadwi, translated by Dr. M. Asif Kidwai, pp. 298, price Rs. 22/- :*

"The book deals with the four fundamental duties, *Salat*, *Saum*, *Zakat* and *Haj* and, along with these, their logical advantages and significance and similarities and differences with the modes of worship in other religious communities. It has, thus, at once become a treatise on jurisprudence, scholastic theology and religious teachings and principles."

SIDQ-I-JADID
July 26, 1968

The Musalman : *by S. Abul Hasan Ali Nadwi, translated by Mohiuddin Ahmad, pp. 120, price Rs. 10/- :*

"Designed to present a true picture of the Indian Muslims before the non-Muslims, the book succeeds in portraying their social customs and manners, religious observances and feasts and festivals without either magnifying or concealing any facet of their life. A book which ought to be translated in every Indian language."

SIDQ-I-JADIC
Lucknow, July 21, 1972

Faith versus Materialism : *by S. Abul Hasan Ali Nadwi, translated by Mohiuddin Ahmad, pp. 114, price Rs. 10/-.*

"This is a commentary of *Surah Kahf* (The Cave) which occupies a unique place in the Quran ...... In delineating the hidden traits and characteristics of Dajjal the author has brought to light the trickery and swaggering deception of the present-day God-less materialistic civilization. Through his lucid exposition of the message contained in this chapter of the Quran the author has shown how its teachings can be efficacious in achieving deliverance from these evils.

ISLAM AUR ASR JADID
Delhi, July, 1972

Qadianism : *by S. Abul Hasan Ali Nadwi, translated by Zafar Ishaq Ansari, M. A., pp. 152, price Rs. 13/- :*

"A critical study of the Qadiani Movement in the light of historical research. The book has gone a long way in correcting many misconceptions and errors lending force to the Movement."

New Menace and its Answer : *by S. Abul Hasan Ali Nadwi, pp. 24, price Re. 1.50.*

Glory of Iqbal : *by S. Abul Hasan Ali Nadwi, translated by Dr. M. Asif Kidwai, pp. 228, price Rs. 10/-*

Nadwa Book Depot P.B. 93 Lucknow - 7

پندرہ روزہ

تعمیرِ حیات لکھنؤ

جلد نمبر ۱۲ — سالانہ: بارہ روپئے

شمارہ نمبر ۱۹ — فی پرچہ: ۵۰ پیسے

شعبۂ تعمیر و ترقی دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

۱۰ اگست سنہ ۱۹۷۵ء ——— یکم شعبان سنہ ۱۳۹۵ھ

دبستانِ فکر اور مکتبِ خیال

ہمارے ملک میں مسلم اقلیت کے سینکڑوں تعلیمی ادارے ہیں جن میں عصری علوم اور دینی تعلیم دی جاتی ہے۔ مگر ان سب اداروں کی حیثیت درس گاہ کی ہے مکتبِ فکر School of thought کی نہیں۔ ہندوستان میں چار تعلیمی اداروں کو (جن کا آغاز اولاً کسی تحریک سے ہوا تھا) ہم تعلیمی ادارے Education Institution سے زیادہ مکتبِ خیال اور دبستانِ فکر کہہ سکتے ہیں۔ یہ ہیں دارالعلوم دیوبند، مسلم یونیورسٹی علیگڑھ، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی اور دارالعلوم ندوۃ العلماء۔

یہ چاروں تعلیمی ادارے اپنے قیام کا وسیع پس منظر اور اہم مقصد رکھتے ہیں۔ ان کے قیام میں اس زمانہ کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی انقلاب و عوامل کا بڑا دخل ہے جو ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں کی سیاسی بساط الٹ جانے سے پیدا ہوئے تھے۔ ہندوستان میں انگریزی حکومت کے قدم اچھی طرح جم چکے تھے، وہ اپنے ساتھ جدید علوم اور نئے افکار و خیالات کا ایک بڑا لشکر ساتھ لائی، ہندوستانی مسلمان اس وقت زخم خوردہ، مضمحل اور شکستہ خاطر تھے، ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں ان کی عزت و خودداری پر ضرب کاری لگی تھی دوسری طرف ان کو نئے فاتح کا رعب، نئے حالات کی دہشت، ناکامی کی شرم اور مختلف شکوک و شبہات اور تہمتوں کا سامنا تھا، اس پیچیدہ اور نازک حالت میں دو قسم کی قیادتیں ابھر کر سامنے آئیں، پہلی قیادت دینی قیادت تھی جس کے علمبردار علمائے دین تھے، دوسری قیادت کے علمبردار سر سید احمد خاں مرحوم اور جدید مکتب خیال کے افراد تھے۔

علماء نے جب مغربی تہذیب کی عوام میں غیر معمولی مقبولیت اور مسلمانوں کے عقائد اور اخلاق و معاشرت میں اسکے اثرات کو دیکھا تو انہیں اقدام کے بجائے دفاعی پوزیشن اختیار کرنے پر مجبور ہونا پڑا، انہوں نے اس کی فکر کی کہ دینی جذبہ، اسلامی روح، اسلامی زندگی کے مظاہر اور تہذیب اسلامی کے جتنے بچے کھچے آثار باقی رہ گئے ہیں، ان کو محفوظ رکھنے کی کوشش کی جائے اور اسلامی تہذیب اور ثقافت کے نئے قلعہ بندیاں کر لی جائیں اور پھر ان قلعوں میں (جن کو عربی مدارس کے نام سے پکارا گیا ہے) مبلغ اور داعی تیار کئے جائیں۔

اس عظیم اصلاحی اور تعلیمی تحریک کا (جس کا آغاز ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۸۶۶ء میں ہوا) سربراہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بانی دارالعلوم دیوبند تھے ____ مولانا سید مناظر احسن گیلانی، مولانا محمد قاسم صاحب کے تذکرہ "سوانح قاسمی" میں لکھتے ہیں:-

"۱۸۵۷ء کی کشمکش کی ناکامی کے بعد قتال اور آویزش کے نئے محاذوں اور میدانوں کی تیاری میں آپ کا دماغ مصروف ہوگیا، دارالعلوم دیوبند کا تعلیمی نظام اس لائحہ عمل کا سب سے زیادہ نمایاں اور مرکزی جزو ہی منظر تھا"

اس تحریک اور اس کے قائدین نے ہندوستانی مسلمانوں کے اندر دین کی محبت، شریعت کا احترام اور اس کے راستہ میں قربانی کی طاقت اور مغربی تہذیب کے مقابلہ میں زبردست استقامت و صلابت پیدا کر دی۔

دوسری قیادت جس کا پرچم سر سید احمد خاں مرحوم نے بلند کیا وہ مغربی تہذیب اور اس کی مادی بنیادوں کی تقلید اور جدید علوم کو انکے عیوب و نقائص کے ساتھ اور بغیر کسی تنقید و ترمیم کے اختیار کر لینے کی داعی تھی، اسلام اور قرآن کی اس طرح تفسیر اور توجیہ جو دور عصری کے آخر کے سائنسی معلومات اور مغربی تمدن کے معیاروں کے مطابق ہو اور اہل مغرب کے ذوق و مزاج کے ساتھ ہم آہنگ ہو اور ان طبعی حقائق اور طبعی اسرار کے انکار پر قائم تھی جو حواس اور تجربہ کی دسترس سے بہت دور ہیں ____ سر سید ایک جگہ لکھتے ہیں:-

"ہندوستان کے مسلمانوں کو کامل درجہ سویلزیشن یعنی تہذیب اختیار کرنے پر راغب کیا جاوے تاکہ جس حقارت سے سویلزڈ یعنی مہذب قومیں ان کو دیکھتی ہیں وہ رفع ہو اور وہ بھی دنیا میں معزز و مہذب کہلاویں"

سر سید احمد خاں اور ان کی تحریک کے [illegible] کمزور پہلو بھی ہیں تاہم اس عظیم تعلیمی تحریک نے بعض ناقابل انکار نتائج پیدا کئے، اس نے ہندوستان کی اسلامی سوسائٹی میں اس تعلیمی اور اقتصادی خلاء کو بڑی حد تک پر کیا جو انگریزی اقتدار اور انقلاب حکومت کے بعد پیدا ہو گیا تھا۔ ایک حد تک اس نے مسلمانوں سے [illegible] اور بد دلی بھی دور کی۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد ۱۹۲۰ء میں مولانا محمد علی جوہر نے چند دوسرے بزرگوں کی رفاقت میں ڈالی تھی۔ اسی زمانے میں حکومت کے خلاف عدم تعاون کی تحریک زوروں پر تھی جس کے زیر اثر قوم کے تعلیمی اداروں کو سرکاری گرانٹ اور سرکاری تعلقات سے آزاد کرانے کی کوشش شروع ہوئی، مولانا محمد علی گڑھ کالج کو آزاد کرانے میں کامیاب نہ ہو سکے، البتہ جو طلباء ان کی حمایت میں کالج سے علیحدہ ہو گئے تھے انہیں لیکر انہوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنا ڈالی، شروع شروع میں تو جامعہ علی گڑھ میں رہی لیکن ۱۹۲۵ء میں دہلی آگئی جہاں حکیم اجمل خاں مرحوم اور ڈاکٹر مختار انصاری مرحوم کی [illegible] اور ڈاکٹر ذاکر حسین شیخ الجامعہ کے حسن انتظام کی وجہ سے اس نے دن دونی رات چوگنی ترقی شروع کر دی۔ جامعہ ملیہ کی بانیوں میں سب سے اہم شخص [illegible] جو علی گڑھ کا اولڈ بوائے تھا جامعہ ملیہ در اصل علیگڑھ کا جواب نہیں بلکہ گہری نظر سے جائزہ لیا جائے تو وہ سر سید کی [illegible] کی تکمیل ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ وہاں کے اساتذہ اور کارکنوں کا ایثار و قربانی، سادہ زندگی، کفایت شعاری، صنعت و حرفت کی تعلیم اور علمی و ادبی اشاعتی مرکز یہ وہ امتیازات ہیں جو اسے علی گڑھ سے ممتاز کر دیتے ہیں۔

۱۹۴۷ء کے بعد آخر الذکر دونوں تحریکیں یا ادارے اپنی انفرادیت بڑی حد تک کھو چکے ہیں اور سو فیصدی سرکاری گرانٹ نے ان کی اصل اسپرٹ کو خاصا متاثر کیا ہے۔ اس ملک کی دیگر جامعات میں یہ دونوں مقصدی ادارے مدغم ہوتے چلے جارہے ہیں۔

علی گڑھ اور دیوبند کی تحریکیں متوازن اور جامع تحریکیں نہیں تھیں۔ ندوۃ العلماء کی فکری تحریک (۱۳۱۱ھ مطابق ۱۸۹۳ء) اور اس کے قائم کردہ دارالعلوم میں اسکی صلاحیت تھی کہ وہ اسلامی اور مغربی ثقافت اور علمائے دین و جدید طبقہ کے درمیان پل کا کام کر سکے اور ایک ایسا متوازن فکر تیار کر سکے جو قدیم و جدید دونوں کے محاسن کا جامع ہو۔ اس مدرسۂ فکر کے ذمہ داروں کے الفاظ میں "اصول و مقاصد میں سخت اور بے لوچ اور فروع اور وسائل میں وسیع اور لچکدار ہو" دین ایک ابدی حقیقت ہے جس میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں لیکن علم ایک پھلنے پھولنے والا درخت ہے جس کا نشو و نما برابر جاری رہے گا۔ ندوۃ العلماء کے بانیوں نے ایسے زمانہ میں اصلاحِ نصاب کی آواز بلند کی جب عالم اسلام کے کسی دوسرے گوشہ میں اس وضاحت و وثوق کے ساتھ اس کی دعوت نہیں دی گئی تھی یہ ایک مبارک قدم اور ایک نیا زاویۂ نگاہ تھا ____ ہم نے مختصر الفاظ میں جو جائزہ پیش کیا ہے اس میں خیالات ہی نہیں بلکہ الفاظ بھی ان بزرگوں سے مستعار لئے ہیں جو ان تحریکوں کے داعی، ترجمان اور شارح ہیں۔ تحریک ندوۃ العلماء کو جہاں قدیم و جدید دونوں حلقوں کا ان کے وسیع اختلاف اور خلیج کی وجہ سے ایسا تعاون نہیں مل سکا جس کی یہ تحریک مستحق تھی وہاں دوسری سب سے بڑی وجہ اس تحریک کے ہمہ گیر نہ ہونے کی یہ بھی ہے کہ اس سے وابستہ اور اس کے قائم کردہ دارالعلوم کے فارغ التحصیل حضرات نے اپنے پیش نظر کوئی واضح مسلک نہیں رکھا، انہوں نے اس تحریک کی دعوت کو عام [illegible] اپنے خلوص، ایثار اور جذبۂ خدمت دین سے ندوۃ العلماء کے [illegible] اسلامیہ کی دعوت کو [illegible] غیر معمولی [illegible] اور وہ اپنا امتیاز و تشخص قائم نہ رکھ سکے۔

[illegible] ندوۃ العلماء [illegible]

[illegible] تحریک اور دبستانِ فکر اور مکتبِ خیال ہے ____

کسی شخصیت اور دعوت پر لکھنے میں اتنی غیر ذمہ داری کا ثبوت نہیں دیا گیا، جتنا سید احمد شہیدؒ اور ان کی تحریک کے بارے میں دیا گیا ہے۔

Saiyid Ahmad Shahid [illegible]

[illegible]

عبدالکریم پاریکھ، ناگپور

کائنات گواہی دیتی ہے

کانپ رہا ہوگا

"یوم تمور السمآء مورا" (۵۲/۹)

(اور اس دن آسمان کانپ رہا ہوگا)

آسمان بھی ایک دن تھرا اٹھے گا، تھرتھراہٹ یا لچک کے معنی میں "مورا" کا لفظ استعمال فرمایا گیا۔ کانپنے اور تھرانے میں کسی چیز کو پیش کیا جاسکتا ہے جس میں لچک ہو اس سے معلوم ہوا کہ آسمان کی پوری چھت میں ایک درجہ کی لچک بھی ہے یا پھر قیامت کے دن اس میں امر الٰہی کے تحت لچک پیدا ہو جائے گی۔ ایک ساکن چھت اس دن گھومنے چکر انے لگے گی اور سارا انتظام عالم درہم برہم ہونا شروع ہوگا۔ دوام اور ہمیشگی کسی مخلوق کو خدا کی بارگاہ میں حاصل نہیں ہے۔ جس وقت تک جس چیز کو کھڑا رہنے کے لئے بنایا گیا تب تک ہی اسے قائم رہنا ہے باقی سب کا وقت آنے پر ہر ایک کو چکر کھا کر گر جانا ہے۔ پس آسمان دنیا چاہے جتنی بڑی مخلوق ہو، ایک دن اسے بھی فنا ہونا لازمی ہے۔

نظام سلطنت

"ھو الذی خلق السمٰوٰت والارض فی ستۃ ایام ثم استوی علی العرش، یعلم ما یلج فی الارض وما یخرج منھا وما ینزل من السماء وما یعرج فیھا وھو معکم این ما کنتم واللّٰہ بما تعملون بصیر" (۵۷/۴)

(اور اسی نے آسمانوں اور زمین کو چھ ایام میں پیدا فرمایا پھر تخت سلطنت یعنی عرش پر جلوہ فرما ہوا، وہی جانتا ہے جو زمین میں داخل ہوتا ہے اور جو کچھ اس سے نکلتا ہے اور جو کچھ آسمان سے اترتا ہے اور جو کچھ چڑھتا ہے، تم جہاں کہیں بھی ہو وہ ہر جگہ تمہارے ساتھ ہوتا ہے اور جو کچھ بھی تم کرتے ہو سب دیکھتا ہے۔)

آسمان وزمین کا نظام سلطنت قدرت کا قائم کیا ہوا ہے۔ اگر ان دونوں کو Command کرنے کے یا باقاعدہ منضبط طور پر چلانے کے لئے ایک مرکزی اقتدار نہ ہوتا تو باوجود ساری مصنوعات کے موجود ہوتے ہوئے کوئی نظام نہیں چل سکتا تھا۔ وحی کی زبان میں اسی کو عرش کہا گیا ہے۔ یہ لفظ کوئی خیالی یا وہمی نہیں بلکہ اس کائنات کے نظام کو چلانے میں ایک مرکزی سلطنت کے وجود اور اس حکومت کا حاکم اعلیٰ ایک ہی غالب حقیقت الملک القدوس العزیز الحکیم ہے۔ تخت سلطنت پر جلوہ فرمائی صرف اسی ایک کی ہے۔ کائنات کو پیدا کرنے کے بعد وہ الگ تھلگ بیٹھ نہیں گیا بلکہ اپنی کائنات پر قابض بھی ہے اور تمام اختیارات اسی کے ہاتھ میں ہیں۔ نہ تو وہ اپنی تخلیق سے غافل ہے نہ کسی دوسرے کے سپرد اس نظام کو کر دیا ہے۔ کائنات کے ہر گوشے میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کے شعور واطلاع سے ہو رہا ہے۔ ایک ایک ذرہ یا فعل پر

زمین کی اندھیاریوں میں داخل ہوتی ہے یا کوئی بھی وہ شغل یا کونپل، پودا، درخت یا ننھی سی گھاس کی سوئی زمین سے نکلتی ہو، بارش کا ایک قطرہ جو آسمان سے اترا ہو یا سمندروں سے اٹھنے والے بخارات ہوں سب اس کے علم میں ہیں۔ اس کے وسیع علم جیسا علم کسی مخلوق کو حاصل ہی نہیں، لہٰذا کوئی بھی کسی درجے میں اس پاک اور کامل ہستی کا شریک ہرگز ہرگز نہیں ہو سکتا۔

آگ کے شعلے

"وانا لمسنا السمآء فوجدنٰھا ملئت حرسا شدیدا وشھبا ۵ وانا کنا نقعد منھا مقاعد للسمع فمن یستمع الاٰن یجد لہ شھابا رصدا ۵" (۷۲/۸-۹)

(اور آسمان کو ہم نے ٹٹول کر چھو کر دیکھا تو ہم نے پایا کہ وہ سخت چوکی، پہرہ اور شدید انگاروں اور آگ کے شعلوں سے بھر پور ہے اور یہ کہ ہم آسمان میں سُن گن لینے کو جگہ پا کر بیٹھتے تھے اب جو کوئی سننا چاہے تو اپنے لئے ایک تیار شعلہ پاتا ہے۔)

جنات ایک نادی مخلوق ہیں۔ انہیں اپنے جسم کی لطافت اور عدم ثقل کے سبب فضائے آسمانی میں پرواز وسکونت، خاکی مخلوق کے مقابل بہت آسان ہے۔ ان کا بیان قرآن کی سورۂ جن میں درج ہے اسے ہم نے اوپر نقل کیا ہے، نزول قرآن کے ساتھ ان کا وہاں جانا اب بند ہوا کہ آتشیں تیروں کی سخت اور ناقابل عبور بارش کے سبب ان کے تمام اڈے جل کر بھسم ہوئے اور کہانت وفن نجوم وغیب دانی کی خبریں اور رمل وغیرہ قسم کے علوم اب تمام تر مشکوک ہو کر رہ گئے۔ اب یا تو علم وحی یا انسان کے تجرباتی ادوار میں حاصل شدہ علوم ہی مستند اور کارآمد ہے۔ باقی علوم کے داعی خود ہی اپنی جگہ چھوڑ چکے، تب ان علوم کی کوئی اہمیت نہ رہی، نزول قرآن تک اس طرح کے علوم صفحۂ ہستی میں اپنا وجود بہر حال رکھتے تھے لیکن قرآن اور حضور اکرم کی آمد کے بعد ایسے علوم کی اب کوئی ضرورت باقی نہ رہی۔ سورۂ جن اور سورۂ احقاف میں جناتوں کے قول سے حسب ذیل باتوں کا خلاصہ ملتا ہے۔

جنات ایک آتشیں مخلوق ہے۔ آسمانوں کی بلندیوں تک اس کی پرواز ممکن ہے۔ نزول قرآن کے ابتدائی ایام میں انہیں اپنے مشاغل میں دشواری پیش آئی اور زمین پر انہوں نے چھان بین شروع کی کہ آیا کیا وجہ ہے کہ فضائے آسمانی میں پہلے کی بہ نسبت اب سخت چوکی پہرہ بٹھا دیا گیا۔ جناتوں کے ایک گروہ نے ڈھونڈ کر اس سبب کو تلاش کر ہی لیا اور وہ سبب تھا انسانوں کی ہدایت کے لئے نزول قرآن کا شروع ہونا، چونکہ اندازے اور تخمینے، وہم وگمان، صحیح وغلط کی آمیزش

سے مجروح علوم سے اب انسان کو کوئی نفع نہیں پہونچ سکتا۔ اس لئے ان علوم کو بے قیمت کر دینا ہی مناسب مانا گیا اور اس کے مقابلے میں انسان کو آئندہ زندگی کے لئے حقیقت کا علم ہی کام دے سکے گا اس لئے نامکمل اور ادھورے علوم کے مقابل اسے وحی الٰہی اور عینی مشاہدہ وتجربہ سے مدلل علم کو مناسب اور موزوں سمجھا گیا۔ اللہ تعالیٰ کی یہ قدیم سنت مبارکہ رہی ہے ناکارہ چیزوں کو ہٹا کر کارآمد اشیاء کو ان کے مقامات پر لایا جائے تاکہ یہ ہنگامۂ حیات برابر دلچسپی کا سبب بنا رہے۔

"فاما الزبد فیذھب جفآء واما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض" (۱۳/۱۷)

کرسی اقتدار کے گھیرے میں

"وسع کرسیہ السمٰوٰت والارض ولا یؤدہ حفظھما وھو العلی العظیم" (۲/۲۵۵)

(گھیرے میں لئے ہوئے ہے اس کی کرسی آسمانوں اور زمین کو، اور ان کی نگہبانی کرنا اللہ کو تھکا نہیں سکتا۔) اس کا اقتدار اعلیٰ اور کرسی اقتدار زمین وآسمانوں کو اپنے اندر سمائے ہوئے ہے۔

اس نظام کو تھام رکھنا خلاق العلیم کے لئے تھکانے والا کام نہیں ہے بلکہ اس کی حفاظت اور نگہداشت اس کے لئے بالکل آسان ہے۔ پیدا کرنے کے بعد اپنی تخلیق سے غافل نہیں ہوا، بلکہ اپنے کارخانۂ تخلیق کا نظام خود ہی چلا رہا ہے۔ خود اکیلا ہی اس ناپیدا کنار سلطنت پر بالفعل حکمرانی کر رہا ہے۔ کرسی اقتدار کا یہ تصور شرک ہو یا ملحد کے کسی فرد نے آج تک اپنے خیالی شریک کے لئے نہیں کیا یہ اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ اتنے بڑے اقتدار اعلیٰ کا زبانی دعویٰ بھی کر لینا کسی مخلوق کے بس کی بات نہیں۔ حکمرانی وسلطانی کا گھیرا ہر جگہ اسی ایک عظیم کرسی کا ہر شئی پر محیط ہے۔ دعویٰ، دلیل، امر واقعہ ہر لحاظ سے اسی ایک خدائے ذوالجلال کے شایان شان ہے کہ اپنی مخلوق پر اسے حق حکمرانی حاصل ہے اسے کوئی مانے تب بھی، اور نہ مانے تب بھی ہر ایک پر اسی کی حکمرانی قائم ہے۔ دنیا کے بادشاہوں کی طرح اقتدار کسی کی طرف سے اسے تفویض نہیں ہوا اور نہ کسی کے بنانے سے وہ حاکم ہوگیا، بلکہ طوعاً وکرہاً ہر ایک پر صرف اسی کو حاکمیت حاصل ہے۔ دنیا کا ہر ایک عارضی حاکم اپنی دنیا یا اقتدار سے تھک کر بیٹھ بھی جاتا ہے، سوتا ہے اور مر بھی جاتا ہے۔ لیکن وہ حی القیوم ایسا عالی شان ہے کہ اپنی مخلوق کی نگہداشت میں اسے کبھی تکان نہیں ہوتی۔

شرف ہم کلامی

"تنزیلا ممن خلق الارض والسمٰوٰت العلیٰ ۵ الرحمٰن علی العرش استویٰ ۔" (۲۰/۴-۵)

(اتارا ہے اس قرآن کو اس نے جس نے زمین بنائی اور آسمان اونچے کئے، وہ رحمٰن ہے تخت سلطنت پر جلوہ فرمائی اسی کی ہے)

قرآن کا نازل کرنے والا کون ہے؟ اس کی معرفت

ان آیات میں کرائی گئی ہے۔ زمین کو بنا دینا، آسمان کو اونچا اٹھا دینا، اور تخت سلطنت کو قائم کر دینا یہ کام جس نے کئے ہیں اسی نے قرآن کو نازل کیا ہے۔ یہ اس سلطان کائنات کا کلام ہے جو بلا شرکت غیرے اس کائنات کا بادشاہ حقیقی ہے۔ اپنی مخلوق میں بنی آدم کو شرف ہم کلامی عطا کرنے کے لئے ایسا کلام اس نے نازل فرمایا، جب بھی بندہ چاہے اپنے خالق ومالک سے بات کرلے۔

بند کو کھول دیا

"اولم یر الذین کفروا ان السمٰوٰت والارض کانتا رتقا ففتقنٰھما وجعلنا من الماء کل شیء حی افلا یؤمنون" (۲۱/۳۰)

(کیا ان نافرمانوں نے غور نہیں کیا آسمانوں اور زمین کی ساخت پر کہ ان کے منھ بند تھے پس ہم نے انہیں کھول دیا، اور پانی کو ہم نے زندگی کا سبب بنا دیا، کیا پھر بھی یہ نہیں مانیں گے)

یہاں قرآن ہمیں بتاتا ہے کائنات کی ابتدائی شکل ایک توده کی سی تھی یعنی زمین، آسمان خلا سب ملے ہوئے تھے پھر ان کو خدا نے کھول دیا اور الگ الگ کر دیا اب کائنات کا منھ کھل گیا مگر انسان بہر حال اسی تودے (mass) میں بندھا ہے، گھرا ہوا ہے۔ رہا پانی تو یہ ہر ذی حیات کی زندگی کے قیام کا ذریعہ ہے۔ پانی کی تخلیق اگر نہ ہوتی تو زندگی کی بقا کی کوئی ضمانت نہ تھی۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ تودہ کو توڑ کر مخلوقات کو اس میں پھیلا دیا پانی بھی ساتھ ساتھ بنا دیا کہ زندہ رہ سکیں۔ معلوم ہوا کہ آدمی اور دوسری تمام مخلوقات گھمٹ یا انڈے میں بند ہیں کہیں سے بھی بھاگ نکلنے کی جگہ نہیں۔

نہیں سمجھوگے

"ان ربکم اللّٰہ الذی خلق السمٰوٰت والارض فی ستۃ ایام ثم استوی علی العرش یدبر الامر ما من شفیع الا من بعد اذنہ ذٰلکم اللّٰہ ربکم فاعبدوہ افلا تذکرون ۵" (۱۰/۳)

(سچ تو یہ ہے کہ تمہارا رب فقط وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ ایام میں پیدا فرمایا پھر عرش پر جلوہ فرما ہوا کائنات کا انتظام حسن تدبیر سے وہی چلا رہا ہے اس کی اجازت کے بغیر اس کی بارگاہ میں کوئی سفارش کرنے والا نہیں، بس یہی اللہ تمہارا رب ہے فقط اسی کی عبادت کرو کیا تم اب بھی نہیں سمجھوگے؟")

اس آیت میں "یدبر الامر" یعنی حسن تدبیر کا انتظام چلانے کی بات فرمائی گئی۔ نظام کائنات اٹکل پچو یا اندھے کی لاٹھی کی طرح نہیں بنا بلکہ جو کچھ ہو رہا ہے ایک منصوبہ بندی اور حسن تدبیر سے ہو رہا ہے۔ کسی بھی کام میں کوئی غیر اللہ دخل نہیں دے سکتا جب تک کہ اس کی اجازت و مرضی جانے بغیر کوئی بھی کسی کے لئے سفارش تک نہیں کر سکتا۔ مشرکین نے عقیدۂ شفاعت میں طرح طرح کی ٹھوکریں کھائی ہیں اور اپنے وہمی وخیالی معبودوں کی فوج لئے بیٹھے ہیں جو خدا کے دربار میں ان کی سفارش کرے گی، لیکن یہاں

یہ بتایا گیا کہ یہ تمام عقائد جعلی اور جھوٹے ہیں، حق صرف وہی ہے جو اللہ نے خود ارشاد فرمایا، کیا اب بھی حق بات کو سمجھنے میں کسی کو دقت پیش آسکتی ہے؟

عقل والو!

"ان فی خلق السمٰوٰت والارض واختلاف اللیل والنھار والفلک التی تجری فی البحر بما ینفع الناس وما انزل اللّٰہ من السماء من ماء فاحیا بہ الارض بعد موتھا وبث فیھا من کل دابۃ وتصریف الریاح والسحاب المسخر بین السمآء والارض لاٰیات لقوم یعقلون" (۲/۱۶۴)

(آسمان اور زمین کا بنانا، اور رات اور دن کا ادل بدل کر آنا جانا اور کشتی ہونا کہ چلتی ہے دریا میں انسانوں کے نفع کی چیزوں کو اور آسمان سے اللہ نے جو پانی اتارا پھر زمین کو مرے پیچھے زندگی دی اور بکھیرے اس میں ہر قسم کے جانور اور ہواؤں کا الٹ پھیر اور بدلیاں جو حکم کی تابع ہیں زمین اور آسمان کے بیچ، ان تمام میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو عقل سے کام لیتے ہیں)

"ان فی خلق السمٰوٰت والارض واختلاف اللیل والنھار لاٰیات لاولی الالباب ۵ الذین یذکرون اللّٰہ قیاما وقعودا وعلیٰ جنوبھم ویتفکرون فی خلق السمٰوٰت والارض ربنا ما خلقت ھذا باطلا سبحٰنک فقنا عذاب النار ۵" (۳/۱۹۰-۱۹۱)

(یقیناً زمین وآسمان کی تخلیق میں اور رات اور دن کے باری باری آنے جانے میں ان عقلمندوں کے لئے بہت سی نشانیاں ہیں جو یاد کرتے ہیں اللہ کو اٹھتے بیٹھتے اور لیٹتے اور زمین وآسمان کی پیدائش میں غور وفکر کرتے ہیں کہ پروردگار تو نے ان کو فضول اور بے مقصد پیدا نہیں کیا ہے۔ تو بے عیب ہے اور اس نقص سے بھی پاک ہے کہ کوئی فضول کام کرے اسے اب ہمیں آگ کے عذاب سے بچالے)

مشاہدۂ کائنات پر ہر صاحب عقل کو اسی ایک نتیجہ پر پہونچنا لازمی ہے کہ اس کارخانۂ حیات کا کوئی خالق علیم اور مدبر ہے وہی حاکم ہے، رب اور محتسب ہے یہ کائنات نہ خود بخود وجود میں آسکتی ہے نہ بہت سی ہستیوں کے بنائے ہوئے طریقوں سے وجود میں آسکتی ہے اسے کوئی ایسی ہی طاقت supreme power چلا رہی ہے اور اسی نے اس بے شعور کائنات میں حضرت انسان کو بھی کچھ زندگی دیکر بوقت موت اپنے دربار میں طلب کر لیتا ہے۔ پھر باغیوں کو یوم الحساب سزائے عظیم ملتی ہے اور وفاداروں کو اجر عظیم۔ اور نتیجۂ کتب آسمانی اور خدا کے تمام بڑے لوگ اور نیک بندوں نے بھی یہی بتایا ہے۔ لیکن اگر کوئی ... اور بدعقلی اس نتیجہ کے خلاف کوئی اور بات اخذ کرتا ہے تو قرآن نے اس سے پوچھا ہے کہ،

"امن خلق السمٰوٰت والارض وانزل لکم من السمآء ماء فانبتنا بہ حدآئق ذات بھجۃ ما کان لکم ان تنبتوا شجرھا ءالٰہ مع اللّٰہ بل ھم قوم یعدلون" (۲۷/۶۰)

(بھلا وہ کون ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا

کیا اور تمہارے لئے آسمان سے بارش نازل کی پھر اس کے ذریعہ سے بارونق باغات اگا دئیے جن کے درختوں کا اگانا تمہارے بس کی بات نہ تھی، کیا اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی اور بھی حاکم ہے؟ نہیں، نہیں، بلکہ یہ لوگ تو دوسروں کو خدا کے برابر قرار دیتے ہیں)

اب چاہے کوئی دہریہ ہو یا مشرک یہ دعویٰ ہرگز نہیں کر سکتا کہ زمین وآسمان کو اس نے خود بنایا ہے یا اس کے شریکوں نے۔ ہاں دہریہ یہ کہہ سکتا ہے کہ مجھے نہیں معلوم کہ اس کائنات کو کون وجود میں لایا ہے، یا آپ سے آپ خود نظام کائنات وجود میں آگیا۔ اور مشرک یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس نظام کائنات میں خدا کے ساتھ اور بھی میرے خیالی شریک تخلیق میں شامل تھے۔ لیکن یہ دونوں بات کہنے والے اپنی کذب بیانی میں کسی کو خدا کا ہم صفت بنا کر پیش نہیں کر سکتے کہ خدا کے سوا یا خدا کے ساتھ فلاں شخص بھی شریک خلق رہا ہے۔

دھیان کرو

"وکاین من اٰیۃ فی السمٰوٰت والارض یمرون علیھا وھم عنھا معرضون" (۱۲/۱۰۵)

(اور بہت سی ساری نشانیاں ہیں آسمان وزمین کی جن پر سے یہ لوگ گزرتے ہیں پھر بھی ان پر دھیان نہیں کرتے)

زمین وآسمان کی بیشتر نشانیوں سے ہر ایک آدمی کا روزانہ واسطہ پڑتا ہی رہتا ہے۔ آج بارش بہت ہوگئی، کل دھوپ بہت تھی، آج گرمی بہت زیادہ ہے سوکھا پڑ گیا، سردی بہت ہے، ہوا گرم چلی، یہ لو صبح ہوگئی، رات ہوگئی، دوپہر کا وقت ہے، فلاں کی موت ہوگئی، فلاں سخت بیمار ہے، وہ آدمی بہت دکھی ہے، ہمارے فلاں عزیز یہ پودا کاشت ہو چکا ہے، آج گھر میں سانپ نکل آیا یا گھر میں آگ لگ گئی، بچہ گر گیا، حضرت جی کا وقت بدل گیا وغیرہ۔ اتنی سب آیات دیکھ کر بھی اگر ہم ان باتوں سے سبق نکالیں اور دھیان کریں تو ہر جگہ قدرت کا مخفی ہاتھ دکھائی دے گا اور جانوروں کی طرح بے دھیان رہیں تو ان باتوں سے کچھ بھی نتائج نہیں نکال سکیں گے۔

بامقصد تخلیق

"وما خلقنا السمآء والارض وما بینھما باطلا ذٰلک ظن الذین کفروا فویل للذین کفروا من النار" (۳۸/۲۷)

(اور ہم نے آسمان زمین اور ان کے درمیان کی چیزوں کو بے مقصد پیدا نہیں کیا، یہ خیال تو منکروں کا ہو سکتا ہے اور ایسے منکرین کے لئے بربادی ہے آگ کی)

"وما خلقنا السمٰوٰت والارض وما بینھما لاعبین ۵ ما خلقنٰھما الا بالحق ولٰکن اکثرھم لا یعلمون ۵ ان یوم الفصل میقاتھم اجمعین" (۴۴/۳۸-۴۰)

"ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان

ڈاکٹر طیب داؤد علی۔ پرنسپل انجمن کالج بھٹکل

"شاید کہ اُتر جائے ترے دل میں مری بات"

[illegible] اداروں کے نوجوانوں کو حاصل [illegible] کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے [illegible] کے لئے تعلیم و تربیت کا معقول [illegible] کا مناسب اہتمام ضروری [illegible] ان کی آرزوؤں اور [illegible] قوموں نے بھی اپنی نوجوان [illegible] دیا ہے۔ یہ تو ممکن ہے کہ [illegible] کے وسائل و ذرائع مختلف [illegible] مسلم رہی ہے۔ امت مسلمہ [illegible] ہی۔ ابتدائی دینی مدارس [illegible] یونیورسٹیوں کا قیام اس کا کھلا ثبوت ہے۔

[illegible] ایک تاریخ ہے جس کی خبر ہماری آبادی [illegible] شروع ہی سے تعلیم [illegible] شہادت محمود ابن بطوطہ نے [illegible] جب انگریزی اور دوسرے [illegible] میں ایک ادارہ "انجمن حمایت" [illegible] تاکہ آئندہ آنے والی [illegible] سکے۔ اسی ادارہ کے تحت [illegible] کالج کی شکل بنیاد [illegible] کی خوش قسمتی ہے کہ ان کے [illegible] کی انجام دہی سے غافل نہیں [illegible] بہت سے فائدے ہیں [illegible] نہیں پاتیں۔ اسی وجہ سے [illegible] عرض کر دی جاتی ہیں۔

[illegible] اداروں سے سب سے بڑا فائدہ یہ [illegible] بے چارگی کے احساس سے [illegible] کی ہمت ہوتی ہے [illegible] کی قوم اس قابل ہے کہ [illegible] اسی طرح وہ مستقبل میں [illegible] اور تمناؤں کو تعمیر دیتا ہے [illegible] یا کسی دوسرے فرقہ [illegible] پائی جاتی ہے وہ اس کے [illegible] عقائد اور رسومات جو [illegible] ان سے اس کے ذہن کو [illegible] بڑا کام ہے۔ ہمارا مشاہدہ [illegible] اسکولوں میں تعلیم پاتے ہیں ان [illegible] ایسے ہی لوگ نکلتے ہیں جن کی [illegible] اسلامی اقدار کوئی خاص اہمیت [illegible] کی خاطر بے خود دین کے متعلق [illegible]

[illegible] خود دین کو کما حقہ سمجھنے کے لئے [illegible] سے بھرپور واقف ہوں۔ [illegible] علوم کی تعلیم کے بغیر ان کے نام نہیں

صحیح طور پر اسلام کو سمجھا جا سکتا ہے اور نہ ہی دوسروں کو اس کی افادیت پر مطمئن کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی کسی اسلامی تحریک کی داغ بیل ڈالی جا سکتی ہے۔ مولانا عمران خاں صاحب ندوی، امیر تبلیغی جماعت بھوپال کا یہ فرمانا "علوم انسانیہ و سائنس کی وہ ساری قسمیں جن سے انسانیت کو فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ ان کا حصول نہ صرف یہ کہ اسلام میں ممنوع نہیں بلکہ ان کا حصول واجب ہے" اپنے اندر بڑی معنویت رکھتا ہے اور ہمیں غور و فکر کا پیغام دیتا ہے اور ایک نئے انداز سے محو داحتساب پر اکساتا ہے۔

چوتھا فائدہ یہ ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی اقتصادی حالت بہت خراب ہے۔ مسلسل فسادات نے اور بھی انھیں کمزور تر کر دیا ہے۔ دستوری تحفظات کے باوجود عالم یہ ہے کہ مسلسل ذہنی کرب میں مبتلا ہیں اور احساس کمتری کے شکار ہیں۔ کبھی ملازمتوں نہ ملنے کی شکایتیں کرتے ہیں، کبھی اپنی مادری زبان کی بربادی پر ماتم کناں ہوتے ہیں۔ کبھی مسلم پرسنل لا کے لئے مضطرب ہوتے ہیں اور کبھی جان و مال کی تباہی و غارتگری پر خون کے آنسو بہاتے ہیں۔ ان سب کا مداوا اگر کچھ ہو سکتا ہے تو تعلیم ہے۔ جس وقت ان کے اندر تعلیمی صلاحیت و قابلیت پیدا ہوگی اسی وقت وہ خود اپنا مقام پیدا کر لیں گے اور ان حالات سے نپٹنے کی راہیں نکال کر لیں گے۔ جاہل اور تعلیم سے عاری رہ کر وہ نہ صرف اپنی حالت کو اور خراب کر لیں گے بلکہ خود ملک و ملت کے لئے بھی وبال جان بن جائیں گے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ مسلمان زیادہ سے زیادہ تعلیم حاصل کر کے ایک طرف اپنی اقتصادی بسماندگی دور کریں اور دوسری طرف اپنی قابلیت سے وہ راہیں ڈھونڈیں جن سے ان کی زبان، ان کی تہذیب، اور کلچر کی حفاظت ہو سکے۔

پانچواں فائدہ یہ ہے کہ ان مسلم اداروں میں مسلمان اپنی مرضی کے مطابق مذہب کی تعلیم دے سکتے ہیں۔ دستور ہند میں اس کی پوری صراحت ہے اور سپریم کورٹ نے اپنے مختلف مقدمات میں اس کی بھرپور وضاحت کر دی ہے کہ اقلیتوں کو اپنے تعلیمی اداروں میں سیکولر تعلیم کے ساتھ ساتھ مذہبی تعلیم دینے کی پوری آزادی ہے اور گورنمنٹ کی گرانٹ ملنے یا تسلیم شدہ ہونے سے انھیں ان کے اس حق سے محروم نہیں رکھا جا سکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کے اسکولوں اور کالجوں میں دینیات کی تعلیم بے خوف و خطر اپنی مرضی کے مطابق دی جا سکتی ہے۔ یہ ایک دستوری حق ہے جس سے پورا فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

یعنی مسلمان اگر چاہیں تو اداروں سے دنیوی علوم کے ساتھ ساتھ دینی علوم کی تعلیم و تدریس کا پورا پورا انتظام کر سکتے ہیں۔ چونکہ ابھی تک عام لوگوں کی نگاہوں سے یہ بات پوشیدہ ہے کہ اس وجہ سے نہ تو مسلمان اداروں سے اپنا ربط قائم کرنے میں خوشی محسوس کرتے ہیں، نتیجہ یہ ہے کہ سالانہ ایک معقول رقم صرف کرنے کے باوجود مسلمان قوم اچھا ادارہ

سے وہ فائدہ نہیں اٹھا پاتی جو اسے اٹھانا چاہیئے، حالانکہ کرسچین اور دوسری اقلیتیں اپنے اداروں سے بھرپور فائدہ اٹھاتی ہیں۔

چھٹا فائدہ یہ ہے کہ قوم کے نادار طلباء کو تعلیم حاصل کرنے کے مواقع ملتے ہیں۔ امیر اور مالدار لوگوں کے لئے اپنے بچوں کو تعلیم دلانے میں کوئی دشواری نہیں ہے۔ ان کے پاس پیسہ ہے دولت ہے۔ وہ چاہیں تو اپنے بچوں کو لندن اور امریکہ میں بھی تعلیم دلوا سکتے ہیں مگر غریب لوگوں کو اتنی سکت نہیں ہوتی کہ وہ اپنے قریب کے کسی مقام کے تعلیمی ادارہ میں اپنے بچے کی تعلیم کا صرفہ برداشت کر سکیں۔ اگر اس طرح کے تعلیمی ادارے قائم کر لئے جائیں تو ہمارے بہت سے غریب اور ذہین طلباء کو اس کا موقع ہی نہ مل سکے کہ وہ اپنی بہترین صلاحیتوں کو اجاگر کر سکیں اس لئے کہ انہیں نہ تو دوسروں کے اداروں میں وظائف مل سکتے ہیں اور نہ ہی وہ تعلیمی سہولتیں حاصل ہو سکتی ہیں جو انھیں اپنے اداروں میں بآسانی دستیاب ہو جاتی ہیں۔ یہ حقیقت سب کو معلوم ہے کہ اگر ایک غریب بچہ تعلیم حاصل کر کے کسی قابل بن جاتا ہے تو در اصل اس کے پورے خاندان اور اس کی آنے والی نسلوں کے لئے آگے بڑھنے کے مواقع فراہم ہو جاتے ہیں۔ اس طرح قوم کی اقتصادی پسماندگی بھی دور ہوتی اور قوم اپنی بہترین دماغی صلاحیتوں کو ضائع کرنے سے بچا لیتی ہے جو اس کے شاندار مستقبل کی تعمیر میں بہت بڑا رول ادا کر سکتی ہیں۔

ساتواں فائدہ یہ ہے کہ اگر مسلمان اپنے تعلیمی اداروں میں غیر مسلم طلباء کے ساتھ شرافت، مروّت، وسعت نظری اور بے لاگ انصاف کا مظاہرہ کریں تو ان کے ذہنوں سے اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں وہ غلط فہمیاں بآسانی دور کی جا سکتی ہیں جنہیں انہوں نے وراثتاً پایا ہے اس طرح ملک میں مسلمانوں کے خلاف پھیلی ہوئی نفرت اور تلخی رفتہ رفتہ ختم کی جا سکتی ہے اور ایک ایسی فضا بنائی جا سکتی ہے جس میں ہندو و مسلم دو اچھے دوست کی طرح ایک ساتھ رہ سکیں اور دونوں کی عزت و آبرو، جان و مال ایک دوسرے کے ہاتھوں محفوظ رہے۔ اس طرح کی فضا پیدا ہونے سے یہ توقع بعید از قیاس نہیں کہ ان اداروں سے فارغ شدہ غیر مسلموں کے ہاتھوں، جب وہ حکومت کے مناصب پر ہوں، مسلمانوں کے ساتھ کوئی بے انصافی نہ ہو۔

اپنے تعلیمی اداروں کو مندرجہ بالا باتوں کے حصول کے

لئے استعمال کرنا مسلمانان ہند کے لئے بہت ضروری ہے اور پورے شعور کے ساتھ ان مقاصد کو حاصل کرنا چاہیئے۔ اگر مسلم تعلیمی اداروں سے یہ مقاصد حاصل نہیں ہوتے تو ہمیں سمجھ لینا چاہیئے کہ ہم قوم کا سرمایہ بے کار ضائع کر رہے ہیں اس لئے کہ محض سیکولر تعلیم کے لئے تو خود حکومت کے ادارے موجود ہیں جن سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے اس کے لئے کسی علیحدہ ادارہ کا قیام اور مالی دشواریوں کا بار اپنے سر لینا کوئی عقلمندی نہیں ہے لیکن اس کے ساتھ یہ حقیقت بھی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں رہنی چاہیئے کہ اگر ان اداروں سے یہ مقاصد حاصل ہو رہے ہیں یا ہونے کی توقع ہے تو پھر مسلمانوں کے لازم ہے کہ بغیر ایک لمحہ ضائع کئے ان اداروں پر اپنی بھرپور توجہ صرف کریں، مالی امداد سے اُسے استحکام بخشیں اور اپنی بہترین صلاحیتیں اس کی نذر کر دیں تاکہ امت مسلمہ کے نوجوانوں کو اچھی تعلیم و تربیت سے آراستہ کیا جا سکے اس لئے کہ مسلمان مستقبل میں عزت و وقار سے اُسی وقت ہندوستان میں عزت و وقار سے اُسی وقت ہندوستان میں زندگی گذار سکتے جب ان کے علوم انسانی اور سائنس و ٹکنالوجی کے بہترین ماہر موجود ہوں تاکہ ان کی علمی برتری سے پورا ملک مرعوب ہو اور حکومت انھیں کلیدی مناصب دینے پر مجبور ہو جائے ساتھ ہی اسلامی اخلاق کی بناء پر غیر مسلموں میں یہ تاثر پیدا ہو کہ نیکی اور اچھائی، ہمدردی و محبت میں مسلمانوں سے بڑھ کر کوئی دوسرا نہیں ہے اور یہی وہ لوگ ہیں جن کے ہاتھوں میں انسانیت محفوظ رہ سکتی ہے اور جن کی سچائی، دیانت داری پر اعتماد کیا جا سکتا ہے ان کو اس کا یقین ہو کہ مسلمان کی نگاہ میں دوسروں کی بہو بیٹی کی عزت خود ان کی بہو بیٹی کی عزت کے برابر ہے۔ نہ وہ خود کسی کی طرف بری نگاہ ڈالیں گے اور نہ ہی کسی بدمعاش کو اپنی آنکھوں کے سامنے کسی سیتا اور مریم کی عصمت سے کھیلنے دیں گے۔ چاہے اس کام میں انہیں زندگی ہی سے ہاتھ کیوں نہ دھونا پڑے۔

مسلمانوں میں عام مایوسی اس وجہ سے ہے کہ وہ ہندوستان میں عددی اعتبار سے اقلیت میں ہیں۔ اکثریت و اقلیت کی باتیں اس طرح سے اور اتنی بار دہرائی گئی ہیں کہ مسلمانوں کا سواد اعظم اب اس حقیقت سے بالکل ہی ناآشنا ہو گیا ہے کہ تاریخ میں جانے کتنے ایسے دور آئے ہیں جب اقلیت اکثریت پر چھائی رہی — قرون اول کی تاریخ ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت اور بعد میں انگریزوں کی حکومت خود اس کے بین ثبوت ہیں۔ آج بھی اسرائیل کے چند لاکھ انسان عرب کے کروڑوں باشندوں پر باوجود سونے اور پٹرول کی دولت کے بھاری ہیں۔ یہی نہیں بلکہ مٹھی بھر یہودی پورے امریکہ کی حکومت پر قابض ہیں۔ جس رُخ سے چاہتے ہیں پالیسی بنواتے ہیں اور جس طرف اشارہ کرتے ہیں حکومت اسی رُخ پر چل پڑتی ہے۔ آج یہودیوں کو جو عزت امریکہ میں حاصل ہے، کبھی آپ نے سوچا کہ اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کی وجہ ہو، اس کے کچھ نہیں ہے کہ ان کے افراد بہترین انسانی دماغ رکھتے ہیں۔ سائنس اور ٹکنالوجی کے مختلف شعبوں میں بہترین صلاحیت کے حامل ہیں۔ کوئی ان کے مدمقابل نہیں۔ اسی وجہ سے حکومت ان کے سامنے جھکنے پر مجبور ہے — دور کیوں جائیے، مدراس کو لے لیجئے۔ سوئیز کے سلسلہ میں مجھے

چند دن قبل وہاں جانا پڑا۔ وہاں کی بڑی بڑی عمارتیں دیکھ کر قدرتاً خیال پیدا ہوا کہ کس نے بنایا۔ معلوم ہوا کہ حکومت کے تمام تعمیری کام زیادہ سے زیادہ دو تین مسلمان ٹھیکداروں کو دئے جاتے ہیں اسی طرح وہاں کا ساحلوں کی طرح رینگتا ہوا پل جہاں دس راستے ایک ساتھ ملتے ہیں اور جس کی تعمیر واقعی دماغی قابلیت کا ایک بہترین نمونہ ہے اُسے بھی حکومت کے ایک مسلمان ٹھیکیدار نے بنوایا ہے — اسی طرح جنوبی ریلوے کے انٹگرل کوچ فیکٹری کے مینیجنگ ڈائرکٹر کے عہدے پر یکے بعد دیگرے تین مسلمان ہوئے اور آج بھی ایک مسلمان ہی اس منصب پر فائز ہے جہاں اُسے غالباً دس ہزار سے زیادہ تنخواہ ملتی ہے۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ حکومت تامل ناڈو کا مسلمانوں پر یہ کرم کسی رشتہ داری کی بناء پر ہے — نہیں، بلکہ اس وجہ سے ہے کہ اُن سے زیادہ ماہر اور دماغی صلاحیت رکھنے والا کوئی دوسرا نہیں ہے اور وہ اپنے فن میں سب سے زیادہ طاق۔ کیا یہی تاریخ اسٹیٹ میں نہیں دہرائی جا سکتی —؟ اور کیا مسلمان سائنس اور ٹکنالوجی میں بہترین مہارت اور امتیاز پیدا کر کے ہندوستان میں اپنا مقام نہیں پیدا کر سکتے — ؟ کیا مختلف شعبوں میں اپنی علمی برتری سے اہل ملک کو اپنا گرویدہ نہیں بنا سکتے اور باوجود اقلیت میں ہونے کے عزت و وقار کی پوزیشن نہیں حاصل کر سکتے ؟ یقیناً کر سکتے ہیں مگر اس کے لئے ضروری ہے کہ مسلمان تن آسانیاں چھوڑ کر علم کے میدان میں اتریں اور اپنی علمی قابلیت اور مہارت سے اہل وطن کو پیچھے چھوڑ دیں تاکہ اہل ملک ہندوستان کی ترقی کے لئے اُن سے استفادہ کرنے پر مجبور ہو جائیں۔ اگر مسلمان اپنے آپ کو اس علمی معیار پر لے آئیں تو انھیں خود معلوم ہو جائے گا کہ اقلیت و اکثریت کا قصہ محض ایک افسانہ تھا اور ان کی مایوسی رجائیت میں بدل جائے گی۔

—×—×—×—×—×—×—

بقیہ صـ۵

ہے کھیل کے طور پر پیدا نہیں کیا۔ ہم نے ان کو برحق اور بامقصد پیدا کیا ہے مگر اکثر لوگ جانتے نہیں۔ درحقیقت فیصلہ کا دن ان سب کے لئے حاضری کا وقت ہے۔)

اوپر درج شدہ آیات یہ بتا رہی ہیں کہ یہ نظام بے مقصد، فضول اور بے نتیجہ یا بطور کھیل نہیں ہے بلکہ یہ بامقصد، نتیجہ خیز اور سنجیدہ منصوبہ بندی کے تحت وجود میں لایا گیا ہے جس کسی نے اسے اس نگاہ سے کہ یہ کائنات بے نتیجہ ہے وہ خود اپنے وجود اور تخلیق کے مقصد باغی ہوگیا ایسے لوگ اگر بے اثر ہیں تو ان کی ذات سے بے عملی اور گناہ کا ظہور ہوگا اور اگر بااثر یا طاقت ور لوگ ہیں تو جب تک زمین پر زندہ رہیں گے ادھم اور فساد برپا کرتے اور مخلوق کی گمراہی کا سبب بنتے رہیں گے۔

خلاصۂ کلام

اب تک آپ نے ان صفحات پر زیادہ تر آسمان کی تخلیق، بندش، افلاک، اجرام سماویہ اور عالم بالا کے نظم و ضبط پر ان چند امور پر مطالعہ فرمایا جو آیات قرآنی سے اخذ کئے گئے تھے اس مطالعہ کا حاصل اگر کچھ ہو سکتا ہے تو صرف یہی کہ اس کائنات کا کوئی بنانے والا ہے اور یہی نتیجہ اصل محرک ہے اس مضمون کے لکھنے کا۔ ظاہر ہے کہ آسمان اور کائنات کی تخلیق کا دعویدار کوئی انسان تو ہے نہیں کہ ہم کو اس مسئلے میں بحث و تکرار کی ضرورت پیش آئے، وحی اور نزول کی دنیا میں اللہ تعالیٰ نے اور صرف اللہ تعالیٰ نے اس کی تخلیق کا دعویٰ کیا ہے۔ اور کائنات زبان حال سے اپنے ایک ہی خالق و مالک ہونے کا برابر اعلان کرتی آرہی ہے۔ ارشاد باری ہے:

"الذی جعل لکم الارض فراشا والسماء بناء و انزل من السماء ماء فاخرج به من الثمرات رزقا لکم فلا تجعلوا للّٰه اندادا و انتم تعلمون" (۲/۲۲)

(اسی نے تمہارے لئے زمین کا فرش بنا دیا، آسمان کی چھت بنا دی اور اوپر سے پانی برسایا، اور پانی کے ذریعہ ہر قسم کی پیداوار بطور رزق تمہارے لئے نکال دی۔ پھر تم جب یہ بات جانتے ہو تو اللہ کے مدمقابل دوسروں کو مت ٹھہراؤ)

دین و مذہب کی دنیا میں تفرقہ شرک سے پیدا ہوا۔ جب آدمی نے خدا کا شریک اپنے جیسے انسانوں کو قرار دیا۔ ہر گروہ نے اپنے کچھ خاص لوگوں کو جو مذہب کی دنیا میں آ رہے تھے خدا کا مدمقابل بنا لیا۔ بس پھر کیا تھا گروہ الگ ہو گئے تو شریک خدا بھی الگ تعداد ہو گئے اسی طرح مذہب اور دین میں ایک طرف اختلاف و اختلاط کی ہوا چل پڑی۔ چونکہ ایک شخصیت ایک گروہ کے نزدیک قابل پرستش تھی تو دوسرے گروہ کے نزدیک دوسری شخصیت خدا کی صفات میں جوڑنے کے قابل تھی۔ اس لئے آپس میں مارا ماری ہونے لگی اور الگ الگ دین و مذہب ایجاد ہونے لگے۔

حالانکہ خدا کا تصور ہر ایک کے پاس تھا۔ لیکن خدا کی صفات بندوں میں تقسیم کی جانے لگیں اور بندے خدا کے شریک بتائے گئے، پھر کیا تھا الگ الگ مسلک ایجاد ہوئے طرح طرح کے مسلک وجود میں آ گئے اور بالآخر آدم کا گھرانہ بٹ گیا اور انسان خدا کا بندہ ہونے کے باوجود بھی بہت سوں کا بندہ بن کر رہ گیا، جو بندے تھے وہ خدا کے بیٹے بنا دئے گئے، کبھی خدا کے وزیر اعظم قرار دئے گئے، کبھی یہ ہوا کہ سورج، چاند اور تارے بھی دیوتا مانے گئے اور کبھی تو آدمی شرک ہو کر ایسی جہالت پر اتر آیا کہ جانور، پہاڑ اور جانوروں تک کو نافع و ضار ماننے لگا۔

اللہ تعالیٰ نے اس گمراہی سے بچا کر ہم پر بڑا احسان کیا کہ ہم نے خدا کا شریک اور ہمسر کسی کو بھی نہیں مانا۔

"ما کان لنا ان نشرک باللّٰه من شیء ذلک من فضل اللّٰه علینا و علی الناس و لکن اکثر الناس لا یشکرون" (۱۲/۳۸)

(یہ ہم انسانوں کی شان اور مرتبہ کے خلاف کہ ہم کسی کو بھی اللہ کا شریک جانیں اور شرک سے بچانا یہ اس اللہ کا ہم پر اور تمام انسانوں پر فضل ہے، لیکن اکثر لوگ اس فضل پر اللہ کا شکر نہیں مانتے)

تعمیرِ حیات کی توسیع اشاعت میں حصہ لیجئے

خشیتِ الٰہی اور خوفِ خداوندی

ایک اسوۂ حسنہ، ایک مثالی کردار، ایک دلگداز واقعے کے آئینے میں

از: محمد ارشد اعظمی

حضرت سعدؓ اپنے والد گرامی حضرت ابراہیمؒ کے واسطے سے اپنے دادا جان حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کا ایک اثر انگیز و دلگداز واقعہ نقل فرماتے ہیں کہ ایک بار حضرت عبدالرحمٰنؓ کے پاس جب کہ آپ روزہ سے تھے افطار کے لئے کھانا لایا گیا تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ حضرت مصعب ابن عمیرؓ نے جام شہادت نوش فرمایا اور مجھ سے وہ بہتر تھے، لیکن آپ صرف ایک چادر میں کفنائے گئے، جو اس قدر چھوٹی تھی کہ اگر ان کا سر ڈھانکا جاتا تھا تو ان کا پاؤں کھل جاتا تھا اور اگر پاؤں ڈھانکا جاتا تھا تو آپ کا سر کھل جاتا تھا آخر کار سر تو ان کا اس چادر سے ڈھک دیا گیا اور پیروں پر اذخر گھاس ڈال دی گئی۔ والد گرامی حضرت ابراہیمؒ فرماتے ہیں کہ میرا گمان ہے کہ حضرت عبدالرحمٰنؓ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ حضرت حمزہؓ جو شہید کر دئے گئے مجھ سے بہتر تھے اور ان کو بھی ایسا ہی کفن نصیب ہوا جیسا کہ حضرت مصعب بن عمیرؓ کو ملا۔ اور جب مسلمانوں کی تنگدستی اور پریشانی کا دور اللہ تعالیٰ کے فضل و رحمت سے ختم ہوا تو پھر ہمارے لئے دنیا اس قدر فراخ کی گئی جو کہ ظاہر ہے یعنی دنیا ہمیں جس قدر دی گئی وہ مل ہی رہی ہے، ہم کو اس بات کا خوف ہے کہ کہیں ہمیں نیکیوں کا صلہ جلد ہی یعنی دنیا ہی میں نہ مل گیا ہو اس ارشاد گرامی کے بعد حضرت عبدالرحمٰنؓ اسی خوف سے اشکبار ہو گئے یہاں تک کہ کھانا ہی چھوڑ دیا۔ (مشکوٰۃ شریف)

حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ بہت ہی باعظمت صحابی ہیں اور عشرہ مبشرہ میں سے ہیں اور حضرت مصعب بن عمیرؓ بھی جلیل القدر بدری صحابی ہیں اور غزوۂ احد میں جام شہادت نوش فرمایا، حضرت عبدالرحمٰنؓ نے جو حضرت مصعب بن عمیرؓ کا تذکرہ فرمایا وہ اسی بنا پر کہ وہ اسلام قبول کرنے سے قبل بڑے مالدار تھے مگر جب ایمان و یقین کی دولت گرانمایہ ملی تو اپنے رب و دین کو اس مقدس شہ سوار سے محسوس کیا، اور ان رسالت میں شامل ہونے تو دنیا کے تمام عیش و آرام کو خیرباد کہہ دیا اور نہایت فقیرانہ زندگی اختیار فرمائی، بقول ہے کہ ایک مرتبہ حضرت مصعب بن عمیرؓ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں اس حال میں حاضر ہوئے کہ کمر میں صرف ایک تسمہ (پوست گوسفند) بندھا ہوا تھا، رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں دیکھ کر ارشاد فرمایا کہ اے میرے صحابہ! اس شخص کو دیکھو اللہ جل جلالہ نے ایمان کی روشنی سے اس کے دل کو منور فرما دیا ہے، میں نے اسے مکہ المکرمہ میں اس حال میں دیکھا ہے کہ اس کے ماں باپ اسے عمدہ سے عمدہ کھانا کھلاتے تھے اور اس کے جسم پر دو سو درہم کے لباس ہوتے تھے مگر اب اس شخص نے اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں اپنے آپ کو اس حال تک پہنچا دیا ہے۔"

حضرت حمزہؓ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے محترم چچا ہیں، بدری ہیں جنگ احد میں جام شہادت نوش فرمایا ہے "سید الشہداء" آپ کا لقب ہے۔ اب آئیے حضرت عبدالرحمٰنؓ کے قول گرامی "ہمیں اس بات کا خوف ہے الخ" کی حقیقت اور آپ کے اس کیف و وجد آفریں حال پر اور خوف و خشیت پر خصوصیت سے غور کر لیا جائے چنانچہ آپ کا منشا یہ ہے کہ دنیا اور دنیا کی نعمتوں نے جس فراخی سے اپنی آغوش ہمارے لئے کھول دی ہے اس کی وجہ سے ہم ڈرتے ہیں کہ کہیں ہم بھی ان لوگوں میں داخل نہ ہو جائیں جن کے بارے میں حق تعالیٰ جل شانہٗ کا یہ ارشاد ہے کہ:-

"جو شخص دنیا کے نفع کی نیت رکھے گا ہم ایسے شخص کو دنیا میں جتنا چاہیں گے فی الحال ہی دے دیں گے ہم پھر اس کے لئے جہنم تجویز کریں گے وہ اس میں بدحال راندۂ درگاہ ہو کر داخل ہوگا (آیت ع ۲) یا پھر اللہ رب العزت کا یہ ارشاد گرامی کہ:- جس روز کفار آگ کے سامنے لائے جائیں گے کہ تم اپنی لذت کی چیزیں اپنی دنیوی زندگی میں حاصل کر چکے اور ان کو خوب برت چکے" (آیت ع ۲۵)

چونکہ حضرت عبدالرحمٰنؓ پر خوف خداوندی غالب اور ان کا قلب گرامی خشیت الٰہی سے لرزاں اور ترساں تھا اسی لئے آپ کو خیال ہوا کہ مبادا میں ان لوگوں میں داخل ہو جاؤں جن کے بارے میں حق تعالیٰ شانہٗ یہ سخت ترین وعید بیان فرما رہے ہیں، ورنہ تو ظاہر ہے کہ آیت کریمہ کے معنی یہ ہیں کہ جو شخص صرف دنیا اور محض دنیا کی نعمتوں کا خواہشمند و طلب گار ہے اور دنیا و دنیا کی نعمتوں اور لذتوں میں مگن ہو جاتا ہے تو ہم دنیا ہی میں اسے اپنے انعام سے نواز دیتے ہیں، لیکن یہ بات یاد رہے کہ ہم اس کو دیتے وہی ہیں جو ہم چاہتے ہیں نہ یہ کہ جو کچھ اس کی خواہش ہوتی ہے تو حاصل کلام یہ کہ یہ وعید طلبگار دنیا کے لئے ہیں اور ظاہر ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ ان لوگوں میں سے ہیں ہی نہیں وہ تو باعظمت صحابی ہیں عشرہ مبشرہ میں سے ہیں، سابقین اولین میں سے ہیں، قدیم الاسلام ہیں اور خوف خداوندی و خشیت الٰہی کی کیفیت طاری رہتی تھی اسی لئے روزہ دار ہونے کے ساتھ اور شدید احتیاج کے باوجود آپ نے کھانا چھوڑ دیا اور کچھ کھایا نہیں اور یہ ایک روشن ترین حقیقت ہے کہ جب کسی کا قلب خوف خداوندی سے لرزاں ہوتا ہے تو وہ کسی بھی دنیاوی و جسمانی خواہش و لذت کی طرف مائل نہیں ہوتا ہے۔

(ماخوذ از اشعۃ اللمعات ص ۹۱۹ ا ۱۵ و مرقات ص ۳۴۹ و ۳۵۰ ج ۴)

اور اے اسلام کے باعظمت فرزندو! ذرا ہم بھی غور کریں کہ ہمارے قلب میں بھی کس قدر خوف خداوندی اور خشیت الٰہی اور صحابہؓ کے نقوش و تاثرات تابندہ ہیں تڑپ اور درد ہے۔؟؟

جب "اُردو" "مسلمان" نہ تھی

جناب طیش صدیقی نے اُردو صحافت کی تاریخ ترقی پر ایک طویل مقالہ سپرد قلم کرتے ہوئے کچھ ایسے اخبارات و رسائل کا بھی ذکر کیا ہے جو انیسویں صدی میں صرف ہندو حضرات نے جاری کئے اور ان میں بعض انتہائی مقبول عام تھے ذیل میں ان اخبارات اور ان کے مالکوں اور ایڈیٹروں کے تاریخ اجرا کے ساتھ ملاحظہ فرمائیے:-

نمبر	اخبار	مالک / ایڈیٹر	مقام	سنہ
(۱)	قرانُ السعدین	دھرم نرائن	دہلی	۱۸۴۵ء
(۲)	فوائدُ الناظرین	ماسٹر رام چند	دہلی	۱۸۴۶ء
(۳)	محب ہند	ماسٹر دھرم چند	دہلی	۱۸۴۷ء
(۴)	فوائدُ الشائقین	پربھو دیال	دہلی	۱۸۴۶ء
(۵)	سدھاکر اخبار	تارا موہن متر	بنارس	۱۸۴۸ء
(۶)	گوالیار اخبار	لکشمی پرشاد	گوالیار	۱۸۴۸ء
(۷)	بنارس اخبار	رگھوناتھ گھوش	بنارس	۱۸۴۸ء
(۸)	عمدۃ الاخبار	لچھمن پرشاد	بریلی	۱۸۴۹ء
(۹)	مالوہ اخبار	دھرم نرائن	اندور	۱۸۴۹ء
(۱۰)	الحقائق	موتی لال	آگرہ	۱۸۴۹ء
(۱۱)	کوہ نور	منشی ہرسکھ رائے	لاہور	۱۸۵۰ء
(۱۲)	خورشید عالم	منشی دیوان چند	سیالکوٹ	۱۸۵۰ء
(۱۳)	باغ و بہار	مہاراجہ بنارس	بنارس	۱۸۵۱ء
(۱۴)	نور الابصار	منشی سدا سکھ	آگرہ	۱۸۵۲ء
(۱۵)	آفتاب ہند	بابو گوبند رگھوناتھ	بنارس	۱۸۵۲ء
(۱۶)	وکٹوریہ پیپر	منشی دیوان چند	لاہور	۱۸۵۳ء
(۱۷)	سحر سامری	گنگا نرائن عیاش	لکھنؤ	۱۸۵۶ء
۱۸	مفید خلائق	جیونرائن	آگرہ	۱۸۵۶ء
۱۹	خلاصۃ الاخبار	متھرا داس	دہلی	۱۸۵۶ء

بنارس سے قریب قریب ایک ہی زمانے میں چار اُردو اخبار نکلتے تھے اور وہ بھی خود ہندوؤں کے ہاتھوں۔

اس فہرست میں ذکر صرف ۱۸۵۶ء تک کا ہے۔ اس کے بعد بھی کثرت سے روزنامہ مثلاً اودھ اخبار (لکھنؤ) اخبار عام (لاہور) دیش (لاہور) ملاپ (لاہور) پرتاپ (لاہور) تیج (دہلی) مشیر دکن (حیدرآباد) اور ہفتہ وار مثلاً تفریح (لکھنؤ) آزاد (کانپور) مادر طوطی ہند (دہلی) اور ماہنامے مثلاً زمانہ (کانپور) زبان (دہلی) ادیب (الٰہ آباد) تحفہ نظر (لکھنؤ) صبح امید (لکھنؤ) وغیرہا۔

التفاتِ کلام

محمد نعیم ندوی صدیقی ایم۔اے (علیگ و شبلی)

سحر بیان خطیبوں اور بڑے بڑے انشاء پردازوں سے لے کر ایک معمولی شخص کی تحریر و تقریر میں بھی دیکھا جاتا ہے کہ وہ اپنے مدعا کو ثابت کرنے کے لئے مختلف اسلوب اختیار کرتا ہے اور بدلتا رہتا ہے، کبھی مخاطب کو غائب فرض کر لیتا ہے، کبھی حاضر کو غائب کی طرح خطاب کرتا ہے، کبھی کلام میں اپنے تکلم کی شان باقی رکھتا ہے اور کبھی اپنے اوپر غائب کا پردہ ڈال لیتا ہے۔ کبھی گذشتہ واقعات کو آنکھوں کے سامنے کھڑا کر دیتا ہے اور کبھی آئندہ پیش آنے والے واقعات کو پرانی داستان کی طرح دہراتا ہے۔ اس قسم کا انتقال عموماً بڑے بڑے شاعروں اور خطیبوں کے کلام میں پایا جاتا ہے۔ عرب کا مشہور شاعر امرأ القیس کہتا ہے ؎

تطاول لیلک بالاثمد
ونام الخلی ولم ترقد
وبات وباتت لہ لیلۃ
کلیلۃ ذی العائر الأرمد
وذلک من نبأ جاءنی
وخبرتہ عن ابی الاسود

آپ نے ملاحظہ فرمایا عرب کے اس "چلبلے" شاعر نے ان دو تین شعروں میں کتنے "رنگ" بدلے ہیں۔ اس قسم کے انتقال کو علم بیان میں التفات کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں۔ قرآن اپنی فصاحت و بلاغت اور نظم کے اعتبار سے ایک معجز ازکلام ہے لیکن اسلام کے اندر بھی انتقال کی صدہا مثالیں ملتی ہیں، بادی النظر میں کوتاہ نظروں کو دھوکہ ہوتا ہے اور وہ اس قسم کے انتقال کو متکلم کی کوتاہی اور بے خبری پر محمول کرتے ہیں اور جس کلام میں انتقال پایا جائے اس کو فصاحت سے گرا ہوا سمجھتے ہیں۔ لیکن درحقیقت یہ ان کی جہالت اور لاعلمی کا نتیجہ ہے۔ انتقال کلام یعنی اسالیب بیان کی تبدیلی سے کلام میں نقص نہیں آتا بلکہ اس سے کلام اور زیادہ بلیغ اور بلند ہو جاتا ہے۔ اور یہ کمال وہی شخص دکھا سکتا ہے جو میدان بلاغت کا مرد ہو یا جو دریائے سخنوری کی شناوری میں یکتا ہو۔ اچھے کلام کی مثال اچھے کھانے کی ہے جس طرح کام و دہن کو کھانے کا تنوع مرغوب ہے اسی طرح ذہنی خوراک کا تنوع بھی جو اسالیب ہی کی تبدیلی سے حاصل ہوتا ہے، ذہن و دماغ کے لئے مرغوب ہے — ہر صاحب ذوق ایک معمولی باغ کے مقابلہ میں جس میں ایک ہی قسم کے پھول لگے ہوں اس چمن کو ترجیح دیتا ہے جس میں رنگ برنگ کے پھول اور قسم قسم کے چھوٹے بڑے خوشنما درخت ہوں۔ یہی حال "باغ سخن" کا بھی ہے لیکن اگر کوئی بدذوق انواع و اقسام کے کھانوں کو چھوڑ کر سوکھی روٹی کو پسند کرتا ہے اور رنگ رنگ خوش وضع پھولوں کے سامنے صرف ایک قسم کے پھول پسند کرتا ہے تو یہ اس کا ذوق ہے۔ نظر اپنی اپنی پسند اپنی اپنی اسلئے ضروری ہے کہ اصولی حیثیت سے اس مسئلہ پر روشنی ڈالی جائے کہ واقعی التفات سے کوئی فائدہ حاصل ہوتا ہے یا نہیں، اور التفات کے لئے کوئی خاص ضابطہ ہے یا نہیں۔؟

ماہرین فن بلاغت نے اس مسئلہ کی طرف زیادہ توجہ نہیں کی۔ اکثر نے اس کو اٹھایا لیکن بیر حاصل بحث کے بغیر چھوڑ دیا۔ حالانکہ یہ مسئلہ خاص توجہ کا مستحق تھا۔ کیونکہ قرآن کریم جس کا ایک ایک جملہ بلاغت میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے اس کی مثالوں سے پُر ہے۔ بہت سے لوگوں نے محض یہ کہہ کر گلو خلاصی حاصل کر لی کہ یہ کلام عرب کا ایک اسلوب ہے۔ لیکن ظاہر ہے یہ جواب تشفی بخش نہیں۔ اس کے اسلوب کلام ہونے سے کس کو انکار ہے۔ سوال تو اس کی بلاغت کے متعلق ہے کیونکہ اگر اس کے اندر کوئی خاص بلاغت نہیں پائی جاتی تو عرب کے بلغاء کیوں اپنے کلام میں اس کو جگہ دیتے، درحقیقت التفات کلام، کلام کا سنگھار ہے بشرطیکہ موقع اور مناسبت سے ہو۔ اس سے اولاً تو عمومی حیثیت سے بہت سے فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ دوسرے اگر متکلم نبض شناس ہے اور موقع و مناسبت سے کلام کے رنگ کو بدلتا ہے تو اس سے اس کا کلام تاثیر اور زور کے اعتبار سے بہت بلند ہو جاتا ہے۔ قرآن نے جہاں جہاں التفات کیا ہے اگر غور سے دیکھا جائے تو محض التفات کی وجہ سے کلام اپنی تاثیر اور بلاغت کے اعتبار سے بہت بلند ہو گیا ہے۔ اگر قرآن سے التفات کی تمام آیتیں منتخب کر کے یکجا کر لی جائیں تو اسی سے بہت سے اصول معلوم ہو جائیں اور اگر کوئی نفسیات کا ماہر ان آیتوں کو پیش نظر رکھ کر غور کرے تو اسے انسانی ذہن و عواطف کی بہت سی کیفیات کا علم حاصل ہو جائے کیونکہ قرآن نے انسانوں کے ذہن و عواطف کا خیال کر کے ان کو متاثر کرنے کے لئے التفات کیا ہے۔

التفات کے عمومی فوائد

اوپر مذکور ہوا کہ التفات سے دو قسم کے فوائد حاصل ہوتے ہیں، ایک عام فائدے ہیں جو التفات کے ہر موقع پر حاصل ہوتے ہیں۔ دوسرے خاص جو محض ہر التفات کے موقع و محل پر غور کرنے سے معلوم ہوتے ہیں۔ قرآن نے جن اصول کے ماتحت التفات کیا ہے اس کا بیان بعد کو آئے گا۔ یہاں التفات کے عمومی فائدوں کو دکھایا جاتا ہے۔

اہل نظر جانتے ہیں کہ تحریر و تقریر کی تاثیر کا راز زیادہ تر مخاطب کا افکار، جذبات اور خیالات کا لحاظ کرنے میں ہے۔ اس بنا پر مقرر یا انشاء پرداز پر چند چیزیں لازم ہیں۔

۱۔ مقرر اپنی آنکھوں سے اور انشاء پرداز اپنی چشم بصیرت سے مخاطب کے چہروں کا رنگ دیکھتا رہے۔ اگر ان کے چہروں پر کراہت کے آثار ہویدا ہوں اور اس کے کلام سے ان کی دلچسپی کم ہوتی معلوم ہو رہی ہو تو فوراً اسلوب کلام کو بدل دینا چاہئے۔ کیونکہ کلام کا اثر اسی وقت ہو سکتا ہے جب سامع اس کو غور سے سنے اور پوری طرح دھیان لگائے۔ اس لئے متکلم کو چاہئے کہ مختلف اسلوب بیان اختیار کرتا رہے تاکہ اس کا شوق سماع زائل نہ ہونے پائے۔

۲۔ ان کا مقصد چونکہ اپنی بات کو مخاطب کے ذہن و دماغ میں راسخ کرنا ہوتا ہے اس لئے ان پر لازم ہے کہ وہ تمام طریق بیان اور انداز گفتگو اختیار کریں جو اس مدعا کے حصول کے لئے ضروری ہوں اور چونکہ اسالیب بیان میں تاثیر اور قوت تاثیر اور عدم تاثیر پر اثر پڑتا ہے، اس لئے ان کے لئے بغیر اس انتقال کے چارہ نہیں، اسی بنا پر کبھی گذشتہ واقعات کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھینچنے کے لئے حال اور مستقبل کے صیغے لانے پڑیں گے اور کبھی مستقبل کے واقعات کو ان کے واقعی اور یقینی بتلانے کے لئے ماضی کے صیغوں میں بیان کرنا ہوگا۔ وقس علیٰ ذلک۔ اس موقع پر جتنی زیادہ جس کو زبان پر قدرت حاصل ہوگی اور جتنا زیادہ جس کو مواقع کا صحیح اندازہ ہوگا، اتنا ہی زیادہ اس کا کلام موثر اور بلیغ ہوگا۔

۳۔ اگر کلام ایک ہی اسلوب پر جاری ہو تو چونکہ ذہن سامع کو اس اسلوب سے مانوس ہونے کے بعد مفہوم اخذ کرنے میں سہولت ہو جاتی ہے اس لئے سہولت کی وجہ سے ذہن کی توجہ رفتہ رفتہ کم ہوتے ہوتے دوسری طرف منتقل ہو جاتی ہے۔ اس لئے اس کلام کا فائدہ جاتا رہتا ہے لیکن اگر اسلوب میں تبدیلی پیدا ہوتی رہے، کبھی غائب کو حاضر کر کے خطاب ہو، کبھی حاضر غائب فرض کر لیا جائے یا اس طرح اور دوسرے قسم کے انتقال ہوتے رہیں تو سامع کو اس تبدیلی کے کھٹکے سے ہر وقت اپنے ذہن کو متوجہ رکھنا پڑتا ہے۔ اسی لئے ایسے کلام کا اثر بھی زیادہ ہوتا ہے۔

مذکورہ بالا امور سے التفات کے کچھ فائدے سامنے آ گئے۔ ان کے علاوہ اور بھی فوائد شمار کرائے جا سکتے ہیں۔ لیکن اندازے کے لئے اتنا کافی ہے۔ یہ تو التفات کے چند عمومی فائدے کا ذکر ہوا۔ اب ہر التفات کے خاص فائدے کو معلوم کرنے کے لئے اس کے محل پر غور کرنے کی ضرورت ہوتی ہے یہاں اس موضوع کا استقصاء مقصود نہیں ہے، ورنہ قرآن مجید، مشہور خطباء اور انشاء پردازوں کے کلام سے التفات کی مثالیں پیش کر کے اس کی باریکیاں دکھلائی جا سکتی ہیں۔

قرآن میں التفات کے اصول

قرآن عموماً غیبت سے خطاب کی طرف، خطاب سے غیبت کی طرف، غیبت سے تکلم کی طرف، ماضی سے مضارع اور مضارع سے ماضی کی طرف انتقال کرتا رہتا ہے اگرچہ علمائے بیان نے تصریح کر دی ہے کہ اس کے لئے کوئی خاص ضابطہ نہیں ہے لیکن انتقال کی اکثر آیتوں کو پیش نظر رکھ کر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عموماً حسب ذیل اصولوں کے ماتحت قرآن میں انتقال ہوتا ہے۔

۱۔ غیبت سے خطاب کی طرف انتقال عموماً ملامت یا توبیخ کے موقع پر ہوتا ہے کیونکہ کسی کو مخاطب کر کے ملامت

در پردہ اور عدم موجودگی میں ملامت کرنے سے زیادہ کارگر اور موثر ہوتا ہے۔ اس لئے خطاب کرنے سے مخاطب متکلم کی طرف متوجہ ہو جاتا اس لئے متکلم کے جاہ و جلال اور اس کے آثار غیظ و غضب کے مشاہدہ یا تصور سے مخاطب متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس لئے توبیخ اور زیادہ موثر ہو جاتی ہے۔ قرآن میں اس کی متعدد مثالیں ملتی ہیں۔ ایک جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے "قالوا اتخذ الرحمن ولدا لقد جئتم شیئا ادا۔" دیکھئے یہاں توبیخ اور انکار کے موقع پر حاضر کی طرف انتقال ہوا ہے، اس توبیخ میں جو زور ہے اس کو صفحوں میں بھی ادا نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح ایک دوسری جگہ ہے، "ویجعلون لما لا یعلمون نصیبا مما رزقناھم تاللہ لتسئلن عما کنتم تفترون" غور فرمائیں اس خطاب سے تہدید کتنی پرزور ہو گئی۔

۲۔ غیبت سے تکلم کی طرف انتقال عموماً اظہار فضل و انعام کے موقع پر ہوتا ہے۔ اظہار فضل و انعام کا مدعا قرآن پاک میں اس کے سوا اور کیا ہوتا ہے کہ اس فضل و انعام کو حقیقی منعم کی طرف منسوب کرنے اور اس پر اس کا شکریہ ادا کرنے کی دعوت دی جائے اس اعتبار سے اظہار فضل انعام کے موقع پر تکلم ہی کا صیغہ استعمال کرنا مناسب ہے۔ انعام کا ذکر اگر صیغہ غائب کیا جائے تو منعم کی ہستی مخفی اور مستور رہتی ہے اور اس پر ایک گونہ پردہ پڑا رہتا ہے بخلاف متکلم کے کہ وہ سامنے ہوتا ہے اور اس کی ذات تعریف کی محتاج نہیں ہوتی۔ اس لئے اظہار انعام و فضل کا حقیقی فائدہ حاصل کرنے کے لئے صیغہ تکلم ہی لانا چاہئے۔ خدا فرماتا ہے۔ "سبحٰن الذی اسری بعبدہ لیلا من المسجد الحرام الی المسجد الاقصی الذی بارکنا حولہ لنریہ من آیاتنا الخ" مذکورہ بالا فائدہ اس مثال میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ اسی طرح سورہ حم السجدہ میں ہے۔ "قل ائنکم لتکفرون بالذی خلق الارض فی یومین ...... واوحٰی فی کل سماء امرھا وزینا السماء الدنیا بمصابیح۔" اور اپنی حکمت اور قدرت کی تمام نشانیوں کو صیغہ غائب ذکر کرنے کے بعد آخر میں آسمان کو چمکتے دمکتے ستاروں سے مزین کر دینے کے انعام کا ذکر کیا۔ اور غیبت سے تکلم کی طرف انتقال کیا۔ صیغہ غائب ذکر کرنے میں فاعل پر جو ایک قسم کا پردہ تھا وہ تکلم کی طرف انتقال کرنے سے خود بخود [illegible] میں آگئی۔

۳۔ خطاب سے غیبت کی طرف انتقال اظہار ناخوشی کے موقع پر ہوتا ہے کیونکہ کسی عظیم الشان ہستی کا کسی کو مخاطب بنانا اس کے مقرب ہونے کی نشانی ہے، اس طرح شرف تخاطب یا کلام سے محروم کر دینا اس کے مردود اور مبغوض ہونے کی دلیل ہے۔ اس کی مثال میں خداوند تعالیٰ کا قول "حتی اذا کنتم فی الفلک وجرین بھم بریح طیبۃ ...... الخ" پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس آیت میں کافروں کی ناشکری پر ملامت اور ان کے اس فعل پر اظہار ناخوشی مقصود ہے۔ دیکھئے کہ خطاب سے غیبت کی طرف انتقال سے ناخوشی کا اثر بھی ساتھ ہی ساتھ ظاہر ہو گیا۔ سورہ حم السجدہ میں ہے "لا تسجدوا للشمس ولا للقمر واسجدوا للہ الذی خلقھن ان کنتم ایاہ تعبدون فان استکبروا فالذین عند ربک یسبحون لہ ...... الخ" اس میں بصیغہ خطاب ان سے کہا گیا کہ اگر تم اللہ کی عبادت کے مدعی ہو تو شمس و قمر کے خالق کو چھوڑ کر ان کی عبادت کیوں کرتے ہو یا ان کو کیوں واسطہ بناتے ہو۔ اس کے بعد بصیغہ غائب کہا گیا "فان استکبروا الخ" محض اس انتقال میں ناخوشی اور غصہ کی جو تیز جھلک پائی جاتی ہے۔ کیا اس کے بغیر پائی جا سکتی ہے؟

۴۔ خطاب سے تکلم کی طرف انتقال

جہاں تک میرے علم و تحقیق کا تعلق ہے کہیں نہیں واقع ہے۔ اور نہ اس کا کوئی موقع سمجھ میں آتا ہے۔ اللہ جل شانہ نے حضرت موسیٰ کے زمانہ کے ایک مرد مومن کا تذکرہ کیا ہے اور انہوں نے اپنی قوم کو مخاطب کر کے جو ناصحانہ تقریر کی ہے۔ اسکو قرآن میں کئی جگہ نقل کیا ہے۔ ان کی تقریر میں خطاب سے تکلم کی طرف انتقال البتہ پایا جاتا ہے اور ایک عجیب شان بلاغت کے ساتھ جس کو سمجھنے کے لئے پورا واقعہ سامنے لانے کی ضرورت ہے۔

ایک شخص حضرت موسیٰؑ کے کلام کی حقانیت کو دیکھ کر متاثر ہوتا ہے اور در پردہ وہ مسلمان ہو جاتا ہے۔ قوم ابھی تک اس کو اپنا ہم مذہب ہی سمجھ رہی ہے۔ وہ موقع کو موثر پا کر ان کو نصیحت کرتا ہے توحید اور حضرت موسیٰ پر ایمان لانے کی انکو دعوت دیتا ہے۔ یہ مسلم ہے کہ افراد یا جماعتوں کا رجحان اجنبی شخص کے مقابل میں اپنے ہم مذہب اور ہم قوم کی طرف زیادہ ہوتا ہے اور اس [illegible] ان کو اس کے خلوص اور ہمدردی پر پورا اعتماد ہو۔ کیونکہ اس کے خلوص، ہمدردی اور اپنے ساتھ اس کا نفع و ضرر کے اشتراک کا خیال ان کو غلط گمان کی طرف نہیں لیجانے دیتا۔ اسی بنا پر وہ ابھی تک اپنے ایمان کا اظہار ان سے نہیں کرتا۔ کیونکہ اظہار کے بعد باتوں کا سننا اور قبول کرنا تو درکنار الٹے وہ درپے آزار ہو جائیں گے۔ ارشاد و ہدایت کے لئے اس سے بہتر اور کیا طریقہ ہو سکتا ہے۔ ان کو سمجھانے کے لئے بالکل غیر جانبدارانہ طریقہ اختیار کرتا ہے اور وہ حضرت موسیٰ کا نام لئے بغیر ان کو ان کے قتل کے ارادہ سے باز آنے کی دعوت دیتا ہے۔ "أتقتلون رجلا أن یقول ربی اللہ۔" ظاہر ہے "رجلا" سے مراد حضرت موسیٰ ہی ہیں کیونکہ اس کے بعد ہی ہے "وقد جاءکم بالبینات"۔ لیکن مقام کا تقاضا یہی تھا کہ اس موقع پر حضرت موسیٰ کا نام نہ لیا جائے کیونکہ ان کو اس نام سے چڑ تھی۔ پھر کہتے ہیں "ان یک کاذبا فعلیہ کذبہ وان یک صادقا یصبکم بعض الذی یعدکم۔" دیکھئے موقع کا لحاظ کرتے ہوئے کذب کو مقدم رکھا کہ ان کو حضرت موسیٰ کی تصدیق کا گمان نہ ہونے پائے اور اسی بنا پر "کل الذی یعدکم" کی جگہ پر "بعض الذی یعدکم" کہا، تا کہ حضرت موسیٰ کی حمایت کا ان کو خیال نہ ہونے پائے۔ اسکے بعد وہ مرد مومن قوم کو خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے "یا قوم لکم الملک الیوم ظاھرین فی الارض فمن ینصرنا من باس اللہ ان جاءنا۔" دیکھئے کہ یہ جملہ کتنا بلیغ ہے۔ زمین پر ان کے غلبہ و تسلط کو انھیں مخاطب کر کے ذکر کیا لیکن عذاب الٰہی سے ڈرایا تو اولاً عذاب الٰہی کے وقوع کو شرط کے اس حرف کے ساتھ ذکر کیا جو محتمل امور کے لئے مستعمل ہے تاکہ وہ یہ نہ سمجھیں کہ یہ شخص حضرت موسیٰ کی تکذیب پر واقعی عذاب کا قائل ہے، یا ان پر عذاب کا خواہاں ہے۔ دوسرے خطاب سے تکلم کی طرف انتقال کیا، اور بجائے "ینصرکم" کے "ینصرنا" اور "ان جاءنا" کہا تا کہ وہ اس مرد مومن کو بھی اپنے رنج و راحت میں شریک سمجھ کر اس کی نصیحتوں کو قابل قبول سمجھیں۔

غرض اسی طرح قرآن پاک، خطیبوں اور انشا پردازوں کے کلام سے التفات و انتقال کلام کی بکثرت مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں لیکن جیسا اوپر عرض کیا گیا اس وقت موضوع کا استقصاء مقصود نہیں ہے اس لئے ان ہی سطور پر اکتفا کیا جاتا ہے، اگر توفیق ایزدی نصیب ہوئی تو انشاء اللہ آئندہ اس موضوع پر مزید روشنی ڈالی جائے گی۔

غزل

از: ——— (شبیر احمد راہی)

عشق رسوا جو ہوا، اشک بہانے سے ہوا
زخم دل اپنا زمانے کو دکھانے سے ہوا

وہ مسرت نہیں، رونق نہیں تصویر نہیں
حال دل دیکھئے کیا آپ کے جانے سے ہوا

عظمت سجدہ کا احساس نہیں ہے جن کو
کیا خبر ہے انہیں کیا سر کو جھکانے سے ہوا

کون اس دور میں تسلیم کریگا یا رب
ہم پہ جو ظلم ہوا، تجھ کو بھلانے سے ہوا

سرخرو دل جو ہوا اپنا زمانے بھر میں
زخم پر زخم تری راہ میں کھانے سے ہوا

آپ سے شکوۂ بیداد بھلا کیا کرتے
جو ستم ہم پہ ہوا ایک بہانے سے ہوا

غیر کوئی نہ رہا اپنی نظر میں راہی
یہ تغیر اسے آنکھوں میں بسانے سے ہوا

پرنٹر، پبلشر، مسئول سید محمد حسنی نے نامی پریس سے طبع کرا کر دفتر "تعمیر حیات" ندوہ، لکھنؤ سے شائع کیا۔
اڈیٹر: اسحٰق جلیس ندوی

نقوشِ وحدت اور اسلام میں اسکی ضمانت

(عربی سے ترجمہ) ——— (محمد ادریس ندوی مالیگانوی)

یہ بات محتاج دلیل نہیں ہے کہ اسلام دین وحدت (اتحاد کا مذہب) ہے اور تمام ایک ہی امت ہیں۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کی حکمت نے یہ فیصلہ کیا کہ اس امت کو خاتم الامم اور اس کی شریعت کو آخری شریعت قرار دے چنانچہ اسے ایک ایسی شریعت عطا کی گئی جو تمام انسانیت کو ایک ہی قوم و ملت میں مربوط کرتی ہے اور اپنا فیصلہ ایک ایسی شریعت سے کرتی ہے جو آسانی اور سہولت میں اور حرج و مشقت کو دفع کرنے میں معروف ہے اور خدائے وحدہٗ لاشریک لہٗ کی طرف لے جانے والی ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل انبیائے کرام کسی خاص قوم یا ملت کی طرف بھیجے جاتے تھے لیکن ہمارے حضرت محمد مصطفیٰ تمام عالم کے لئے بشیر و نذیر بنا کر مبعوث کئے گئے۔ انبیائے کرام کو ان کی حیات تک اپنی قوم کی ہدایت و رہنمائی کا مکلف بنایا گیا اس کے برعکس حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ساری انسانیت کا قیامت تک کے لئے مکلف بنایا گیا۔ تنہا یہی خصوصیت ہمارے نبی کو دیگر انبیاء سے ممتاز کرتی ہے، خود نبی کریمؐ سے اس بارے میں مروی ہے کہ "مجھے ایسی پانچ چیزیں عطا کی گئیں جو مجھ سے پہلے کسی کو نہیں دی گئیں ان میں سے ایک یہ ہے" تمام انبیاء خاص اپنی قوم کی طرف بھیجے گئے لیکن میں تمام لوگوں کے لئے مبعوث کیا گیا ہوں۔

خدائے تعالیٰ نے اس ہمہ گیر وحدت کا اعلان اپنے قول "وان ھٰذہ امتکم امۃ واحدۃ وانا ربکم فاعبدون" میں کیا ہے۔ چنانچہ تمام مسلمان اسی بنیاد پر ایک امت، ایک ہی قوم ہیں خواہ انکے دیار کتنا ہی بعد مشرق و مغرب کا یا جنوب سے شمال تک کا واقع ہو، وہ کل کے کل حقوق و واجبات میں مساوی ہوتے ہیں آپس میں پریم و محبت سے سرشار ہوتے ہیں اور وہ لوگ ایک ہی مقصد خدائے وحدہٗ لاشریک لہٗ کی عبادت میں کوشاں رہتے ہیں جو زمین کو خیر اور امن و سلامتی سے پُر کرنے کی ضامن ہے۔

اللہ عز و جل نے محض اس ہمہ گیر وحدت کا اعلان کر کے اسے لاپرواہوں اور غافلوں کے لئے چھوڑ نہیں دیا کہ وہ اس کے ساتھ کسی بھی طرح پیش آئیں اور اس کے اصول و ارکان کو ختم کرنے کے درپے ہوں۔ کیونکہ اللہ تبارک و تعالیٰ بڑا ہی حکیم و دانا ہے اس کی حکمت اس بات کی متقاضی ہے کہ وہ اس وحدت کے لئے ایسے پلان و تجاویز پیش کرے جو اس کی بقا و دوام کی گارنٹی دے۔

اس لئے ہم اسلامی احکام میں عام طور پر اور قرآن میں خصوصاً کچھ ایسے قوانین کا مشاہدہ کرتے ہیں جو اس وحدت کی ایسی منظر کشی کرتی ہے جس کے اثرات و نتائج کافی گہرے اور دور رس ہوتے ہیں۔ جب مسلمان ان قوانین پر عمل پیرا ہوتے ہیں جو ان میں اتحاد و اتفاق پیدا کرتے اور نفرت و باہمی بغض و عناد سے بچانے کا باعث ہے تو ان کی وحدت محفوظ ہو جاتی ہے اور وہ ایک ایسی امت بن جاتے ہیں جو خدا کے نزدیک مطلوب ہے۔ وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار اور ایک ہی جسم ہو جاتے ہیں جس کے ایک عضو کی تکلیف تمام اعضا کو متاثر کرتی ہے۔

ان اہم اساس و بنیاد کو اب اجمالاً بیان کیا جاتا ہے۔

۱۔ باہمی محبت و انسیت کی دعوت اور سلام کو عام کرنا:۔ اس باب میں بہت سی نصوص قرآنیہ و احادیث نبویہ وارد ہوئی ہیں جیسے اللہ کا قول "یا ایہا الذین آمنوا لا تدخلوا بیوتا غیر بیوتکم حتی تستانسوا وتسلموا علی اھلھا" اور اللہ عز و جل کا یہ قول کہ جب تم کو مسلمان بھائی سلام کرے تو اسے اچھے طریقے سے سلام کا جواب دو یا کم از کم اسی کی طرح دو۔

حضور اکرمؐ کا بھی ارشاد گرامی ہے "لا تدخلوا الجنۃ حتی تؤمنوا ولا تؤمنوا" تم جنت میں ہرگز نہیں داخل ہو سکتے یہاں تک کہ ایمان لے آؤ اور مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ آپس میں ایک دوسرے سے محبت نہ کرنے لگو کیا تمہیں ایسی چیز نہ بتا دوں جب تم اسے کرو تو آپس میں محبت پیدا ہو۔ اپنے درمیان سلام کو عام کرو۔

ان جیسی آیات و احادیث سے ہمارے لئے باہمی محبت کا مفہوم اور افراد کے باہمی رابطے میں اس کا اثر واضح ہو جاتا ہے۔ کیونکہ حب صادق کے جیسی امت میں ربط پیدا کرنے والی کوئی دوسری چیز نہیں ہے۔ نبی کریمؐ نے اس محبت کی مسلمانوں کو کافی ترغیب دی ہے۔ حتیٰ کہ اسے ایمان کی ایسی بنیاد قرار دیا ہے جس کے ذریعہ انسان جنت میں داخل ہو سکتا ہے۔

اس حدیث سے سلام کی اہمیت اور اس چھوٹے سے کلمے کے مفہوم و اثرات کا زیادہ دور رس ہونے کا پتہ چلتا ہے کیونکہ اسلام قلوب کا بندھن ہے جس سے لوگ باہم جڑتے ہیں اور وہ اس بندھن کو اتنی مضبوطی سے باندھتا ہے کہ اس کے جدا ہونے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا اور ایسا کیوں نہ ہو؟ جب کہ کتنے ہی بغض و عناد رکھنے والوں کے بغض کو سلام نے زائل کر دیا اور کتنے ہی حاسدوں کے حسد کو اس نے دور کر دیا لہٰذا اس میں ذرا بھی تعجب کی بات نہیں اسلام ہر ملاقاتی سے سلام کا خواہشمند ہے خواہ وہ گھر میں ہوں، راستے میں یا کسی اور جگہ ہوں باہم آشنا ہوں یا انجان۔ اگر ایک دوسرے سے آشنا ہیں تو سلام ان کی آشنائی اور محبت میں اضافہ کرے گا اور اگر انجان ہیں تو سلام آپس میں ملنے اور ایک دوسرے کی معرفت کا بہترین ذریعہ ہو گا اور اگر ان کے قلوب بغض و عناد اور کینہ کپٹ سے معمور ہیں تو سلام ان کے بغض و عناد کو کافور کر دیگا۔

۲۔ تقویٰ اور نیکی پر مدد کرنا

امداد و تعاون، الفت و محبت کے قائم رکھنے کا ذریعہ ہے جس سے محبت پروان چڑھتی ہے اور امت میں ربط پیدا ہوتا ہے اس سلسلے میں بہت سی نصوص وارد ہوئی ہیں جیسے خدا عز و جل کا قول "وتعاونوا علی البر والتقویٰ ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان" یہاں "البر" سے وہ تمام اعمال مراد ہیں جو امت کے لئے اور خدا کی مرضی کے عین مطابق ہوں۔ مثلاً عدل قائم کرنا، ظلم سے روکنا، علوم و معارف کی نشر و اشاعت، امانت کی ادائیگی اور رازوں کی حفاظت وغیرہ۔

نبی کریمؐ کا فرمان بھی ہے۔ "امانتدار مسلمان خزانچی جس کو مالک مال دینے کا حکم دیتا ہے اور وہ پورا پورا خوشدلی کے ساتھ مامور الیہ کو دیتا ہے تو وہ بھی صدقہ کرنے والوں میں سے ایک ہے اور نیز ارشاد ہے کہ جس نے مجاہد فی سبیل اللہ کے لئے سامان جنگ مہیا کیا تو گویا اس نے غزوہ کیا۔"

۳۔ مساوات

لوگوں میں محبت کے رشتوں کو مضبوط کرنے اور آپسی بغض و عناد کو دور کرنے کا اس سے بڑھ کر کوئی ذریعہ نہیں کہ انہیں مساوات کے معنی و مفہوم کا احساس پیدا کرا دیا جائے اسلام نے اس کی اہمیت کو بڑے اچھے پیرائے میں بیان کیا ہے اور اسے اپنے اصول و قواعد میں ایک بنیادی قاعدہ قرار دیا ہے اور تمام لوگوں میں کامل اخوت کا اعلان کر دیا۔ اللہ عز و جل قرآن پاک میں فرماتا ہے "انما المومنون اخوۃ" مومن آپس میں اخوت کے رشتے بندھے ہوئے ہیں۔ سفید کالے، غلام اور آزاد اور عربی عجمی میں کوئی فرق نہیں اور جیسا کہ حضور فداہ ابی وامی کا ارشاد گرامی ہے "مسلمان کنگھے کے دانتوں کی طرح یکساں اور برابر ہیں نہ عربی کو عجمی پر اور نہ عجمی کو عربی پر سوائے تقویٰ کے کوئی فضیلت ہے۔" یعنی فضیلت کی بنیاد تقویٰ ہے۔

یہ ارشادات لوگوں کے مابین ہر ایک چیز میں کامل مساوات کا صریح اعلان ہے اور ایسا تمدن ہے کہ موجودہ زمانے تک کوئی انسانی تمدن بھی نہیں پہنچ سکا۔ موجودہ بین الاقوامی جھگڑے، ایک دوسرے کے خلاف برسرپیکار رہنا اور آپسی بغض و عناد کی صرف ایک ہی وجہ ہے اور وہ اس مساوات کے اصول سے [illegible] جو امتوں اور قوموں کو یکجا کرنے والا اور ان کے محبت کے رشتوں کو مضبوط کرنے والا ہے۔

۴۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر

انسان طبعاً خطا کار اور اپنی خواہشات و شہوات کے سبب راہ حق سے منحرف ہونے والا واقع ہوا ہے۔ راہ حق سے انحراف کا یہ رجحان و میلان بے شک امت کے لئے ایک بہت بڑے ضرر کا سبب ہے جو بالواسطہ یا بلا واسطہ اسے پہونچے گا۔

کیونکہ امم سابقہ امر بالمعروف و نہی

عن المنکر کے اصول سے انحراف اور کوتاہی کے سبب تباہ و برباد ہوئیں۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ بنی اسرائیل کے متعلق اپنی کتاب میں یوں گویا ہے "لعن الذین کفروا من بنی اسرائیل علے لسان داؤد و عیسی بن مریم الخ" جس کا مفہوم یہ ہے کہ بنی اسرائیل کی حضرت داؤد اور عیسیٰ نے ان کی سرکشی اور حد سے تجاوز کرجانے کی بنا پر لعنت کی اور وہ لوگوں کو منکر کرنے سے نہیں روکتے۔ کتنا برا ہے جو وہ کرتے ہیں۔

اسلام میں اس اصول کو مقرر کرنے اور اس کی اہمیت و عظمت کی نشاندہی کرنے کے لئے بہت سی آیتیں وارد ہوئی ہیں حتی کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے اسے مسلمانوں پر نماز روزہ کے فرائض کی مثل ایک لازمی فریضہ قرار دیدیا۔ چنانچہ اپنی کتاب مقدس میں یوں گویا ہے "ولتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر و یامرون بالمعروف و ینہون عن المنکر واولئک ھم المفلحون" یعنی اے مسلمانو تم میں ایک ایسی جماعت ہونا ضروری ہے جو بھلائی کی طرف لوگوں کو دعوت دے نیکی کا حکم کرے اور برائیوں سے روکے۔ یہی لوگ فلاح یاب ہیں۔ جیسا کہ خداوند قدوس اپنے رسول کو حکم دیتا ہے خذ العفو وامر بالعرف و اعرض عن الجاھلین۔ یعنی آپ عفو و درگذر کو اختیار کیجئے نیکیوں کا حکم کرو اور جاہلوں سے اعراض کیجئے۔

ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اصول سے لاپروائی برتنے کے خطرہ کو واضح طریقے سے ایک مثال کے ذریعہ بیان فرمایا ہے کہ حدود اللہ کو قائم کرنے کی مثال اس قوم یا جماعت کی طرح جنہوں نے ایک کشتی میں سفر کا ارادہ کیا۔ کچھ بالائی منزل میں ہو گئے اور بعض نچلے حصہ میں جب نیچے والوں کو پیاس لگی تو انہوں نے اوپری حصہ والوں سے پانی طلب کیا لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔ ان لوگوں نے سوچا کہ اوپر والوں کو کیوں تکلیف دیں اپنے ہی حصہ میں تختہ نکال کر پانی حاصل کر لیں۔ اگر بالائی حصہ والوں نے انہیں نہیں روکا تو وہ تمام ہلاک ہو جائیں گے اگر انہیں روک دیں اور ان کے ہاتھ پکڑ لیں تو سب محفوظ رہیں گے اور نجات پا جائیں گے۔

۵۔ لوگوں کا باہم ایک دوسرے کا ادب و احترام کرنا۔

تکریم یہ ہے کہ بڑوں کا احترام اور ان کی توقیر کی جائے اور چھوٹوں سے شفقت و احسان کا برتاؤ کیا جائے۔ خصوصاً والدین کی تعظیم و تکریم نہایت ضروری ہے۔ کیونکہ خدائے عزوجل نے اولاد کو ان کی تکریم کا حکم فرمایا ہے جس طرح کہ والدین کو ان کے ساتھ حسن معاملہ اور شفقت سے پیش آنے کا حکم دیا ہے۔

علماء اور اہل فضل و تقویٰ حضرات کی توقیر بھی نہایت ضروری ہے کیونکہ وہ افراد امت میں جوڑ اور محبت و اخوت کے رشتوں کو مضبوط کرتی ہے۔ اس سلسلے میں بہت سی آیتیں اور احادیث وارد ہوئی ہیں جیسے اللہ تبارک و تعالیٰ کا قول "واخفض لھما جناح الذل من الرحمۃ وقل رب ارحمھما کما ربیانی صغیرا" اور حضور اکرم کا ارشاد گرامی "لیس منا من لم یرحم صغیرنا ولم یعرف شرف کبیرنا" نمایاں ہیں۔

۶۔ ظلم کو روکنا اور حقوق و واجبات میں حدود اللہ پر توقف کرنا۔

اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا ہے "ما للظلمین من حمیم ولا شفیع یطاع" اور رسول کریم کا یہ ارشاد "اتقوا الظلم فان الظلم ظلمات یوم القیامۃ" ظلم و زیادتی سے پرہیز کرو کیونکہ ظلم قیامت کے دن کی تاریکیاں ہیں اور یہ بھی کہ قیامت کے دن حقوق کو ضرور ادا کیا جائیگا حتی کہ سینگ والی بکری سے غیر سینگ والی بکری کا بدلہ لیا جائے گا۔

یہ وحدت کے چند نمونے ہیں جن کو اللہ تبارک و تعالیٰ نے دنیا کے مختلف حصوں میں تمام مسلمانوں کے درمیان مربوط کر دیا ہے اور مرور زمان کے ساتھ ساتھ یہ پختہ اور دلوں میں راسخ کارفرمائیاں اور ضمانتیں ہیں۔ اس سے پہلے کہ اس کے علاوہ کوئی اس زمین میں قائم ہو، ہم خداوند قدوس سے دعا کرتے ہیں کہ ہمیں اس کی بصیرت عطا کرے تاکہ ہم اسے مضبوطی سے اختیار کریں جس کے سبب ہماری قوت اور عزت نیز دشمنوں پر ہماری نصرت عود کر آئے۔ اس لئے کہ حضرت عمرؓ سے مروی ہے کہ "ہم زمانہ جاہلیت میں ایک پست قوم تھے اللہ تعالیٰ نے ہمیں اسلام کے ذریعہ عزت بخشی ہے جب تک ہم غیر اسلام میں عزت اور بڑائی طلب کرتے رہیں گے خدا تعالیٰ ہمیں ذلیل کرے گا۔

اس حدیث کو جاننے کے بعد اب ہمارا فرض ہو جاتا ہے کہ اسلام کے علاوہ دوسرے نظریات اور ازموں میں اپنی مشکلات کا علاج اور غموں کا مداوا تلاش کرنے اور اسی کی بنا پر عزت کے حصول کو ایک بے معنی لاحاصل سعی سمجھ کر دین اسلام سے اپنی وابستگی کو پختہ کریں اور خدا تعالیٰ کے قول "ادخلوا فی السلم کافۃ" پر عمل پیرا ہوں تاکہ دین و دنیا میں ہمیں کامیابی و کامرانی سے سرفراز ہونے کا موقع نصیب ہو۔

تھوڑی دیر اہل حق کے ساتھ

(از: حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا دامت برکاتہم)

حضرت ابوبکر بن عیاشؒ کا انتقال ہونے لگا تو ان کی ہمشیرہ رونے لگیں کہنے لگے بہن رونے کی بات نہیں تیرے بھائی نے مکان کے اس کونے میں بارہ ہزار قرآن پاک ختم کئے ہیں۔ عمرو بن عبید کہتے ہیں کہ ابو شعیب بن صالح بن زیاد بیمار تھے میں ان کی عیادت کو گیا تو ان کی نزع کی حالت تھی مجھ سے کہنے لگے کہ میں تجھے خوشخبری سناؤں، میں اس جگہ ایک اجنبی آدمی کو جو اور ہی سی صورت ہے دیکھ رہا ہوں میں نے اُن سے پوچھا کہ تم کون ہو وہ کہنے لگے کہ میں ملک الموت ہوں میں نے کہا میرے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرنا، وہ کہنے لگے مجھے یہی حکم ملا ہے کہ نرمی کروں۔

حضرت امام احمد بن حنبلؒ کے صاحبزادے فرماتے ہیں کہ میرے والد کا جب انتقال ہونے لگا تو میں ان کے پاس بیٹھا تھا کپڑا میرے ہاتھ میں تھا تاکہ انتقال کے بعد جبڑا باندھ دوں، ان کو غشی ہو جاتی تھی جس سے ہمیں یہ خیال ہوتا تھا کہ انتقال ہو گیا پھر افاقہ ہو جاتا تھا اور اس وقت وہ کہتے کہ ابھی نہیں، ابھی نہیں۔ جب تیسری مرتبہ یہی صورت پیش آئی تو میں نے ان سے دریافت کیا کہ آپ یہ کیا فرماتے ہیں، کہنے لگے بیٹا تمہیں خبر نہیں، شیطان ملعون میرے پاس کھڑا ہے اور رنج اور غصہ سے اپنی انگلی منھ سے دبا رہا ہے اور کہتا ہے احمد تو میرے ہاتھ سے نکل گیا۔ جب وہ کہتا ہے تو میں اس سے کہتا ہوں کہ ابھی نہیں (چھوٹا) (جب تک جان نہ نکل جائے اس وقت تک تجھ سے اطمینان نہیں ہے۔)

حضرت آدم بن ابی ایاسؒ کا جب آخری وقت تھا تو وہ چادر میں لپٹے پڑے تھے اور قرآن شریف پڑھ رہے تھے۔ جب قرآن پاک ختم کیا تو کہنے لگے کہ مجھے جو آپ سے محبت ہے اس کا واسطہ دیکر عرض ہے کہ میرے ساتھ نرمی کا برتاؤ کیا جائے آج ہی کے دن کے لئے آپ سے امیدیں وابستہ تھیں۔ اس کے بعد لا الٰہ الا اللہ کہا اور روح پرواز کر گئی۔ جب مسلمہ بن عبد الملک کا انتقال ہونے لگا تو وہ رونے لگے۔ کسی نے رونے کا سبب پوچھا تو کہنے لگے کہ میں موت کے ڈر سے نہیں رو رہا ہوں مجھے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کامل وثوق ہے میں اس پر رو رہا ہوں کہ میں تیس مرتبہ جہاد میں رہ کر بھی شہادت نصیب نہ ہوئی اور آج عورتوں کی طرح بستر پر جان دے رہا ہوں۔ ایاس بن قتادہ عبشمیؒ نے ایک دن آئینہ دیکھا تو سر پر سفید بال نظر آئے، کہنے لگے کہ سفید بال آجانے کے بعد پھر آخرت کے سوا کوئی مشغلہ نہ رہنا چاہئے کہ اب دنیا سے رخصت ہونے کا وقت آگیا۔ اس کے بعد زیادہ مجاہدے شروع کر دئے۔ ایک مرتبہ جمعہ کے دن نماز سے فارغ ہو کر مسجد سے باہر آرہے تھے آسمان کی طرف دیکھ کر کہنے لگے تیرا آنا مبارک ہے۔ میں تو تیرا بہت ہی سخت انتظار کر رہا تھا اس کے بعد اپنے ساتھ والوں سے کہنے لگے جب میں مر جاؤں تو مجھے (کسی جگہ کا نام ہے) میں لیجا کر مجھے دفن کر دینا اس کے بعد روح نکل گئی اور گر گئے۔

حضرت امام احمد بن حنبلؒ کے شاگرد ابراہیم بن ہانی کا جب انتقال ہونے لگا تو اپنے بیٹے اسحٰق سے دریافت کیا کہ آفتاب غروب ہو گیا انہوں نے کہا کہ ابھی تو نہیں ہوا لیکن ابا جان ایسی سخت بیماری میں تو فرض روزہ کھولنے کی بھی اجازت ہے آپ کا تو نفل روزہ ہے اس کو کھول دیجئے، فرمانے لگے ارے ٹھیر جا اس کے بعد (معلوم کیا دیکھا) فرمانے لگے اسی جیسی چیزوں کے لئے آدمی کو چاہئے کہ عمل کرتا رہے (یہ قرآن پاک کی آیت والصّٰفّٰت ع ۲ کی طرف اشارہ ہے جس میں حق تعالیٰ شانہ کا ارشاد ہے کہ بیشک یہی بڑی کامیابی ہے۔ ایسی ہی کامیابی حاصل کرنے کے لئے عمل کرنے والوں کو عمل کرنا چاہئے) اس کے بعد روح پرواز کر گئی۔

ابن الجوزیؒ کہتے ہیں کہ جب میرے استاذ ابوبکر بن حبیبؒ کا انتقال ہونے لگا تو شاگردوں نے عرض کیا کہ کچھ وصیت فرما دیجئے۔ فرمایا تین چیزوں کی وصیت کرتا ہوں۔ اللہ کا خوف، اور تنہائی میں اس کا مراقبہ اور جو چیز مجھے پیش آرہی ہے (یعنی موت) اس کا خوف رکھا جائے مجھے اکسٹھ برس گزر گئے ہیں لیکن گویا میں نے دنیا کو دیکھا بھی نہیں (ایسی جلدی گزر گئے) اس کے بعد ایک پاس بیٹھنے والے سے پوچھا دیکھو میری پیشانی پر پسینہ آگیا یا نہیں۔ اس نے عرض کیا آگیا فرمایا اللہ کا شکر ہے کہ یہ ایمان پر موت کی علامت ہے (جیسا کہ حدیث میں وارد ہے)۔ امام بخاریؒ کے شاگرد ابو الوقت عبد الاولؒ کے انتقال کا جب وقت آیا تو آخر کلام جو ان کی زبان سے نکلا تھا یہ تھا یالیت قومی یعلمون بما غفرلی ربی وجعلنی من المکرمین (یہ سورۂ یٰسین شریف کے دوسرے رکوع کی آیت ہے جس کا ترجمہ یہ ہے "کاش میری قوم کو یہ بات معلوم ہو جاتی کہ میرے رب نے مجھے بخشدیا اور مجھے معزز اور مکرم لوگوں میں شامل کر دیا۔"

چوتھی قسط

دو ہفتے

اسحٰق جلیس ندوی

تامل ناڈو، کرناٹک اور مہاراشٹر کے چند دینی، تعلیمی اور علمی مراکز میں

یہ عجیب اتفاق ہے کہ جنوبی ہندوستان کے ساحل پر عرب مسلمانوں کی سب سے قدیم نوآبادیاں حجاج بن یوسف کی بدولت وجود میں آئیں۔ اگرچہ اس میں حجاج کی کوشش بلکہ خواہش کو بھی دخل نہ تھا۔ حجاج امویوں کا ملازم تھا اور ہاشمیوں کا شدید مخالف جہاں کہیں وہ جاتا بنی ہاشم کے طرفدار ترک وطن پر مجبور ہو جاتے جب وہ عراق کا گورنر ہوا تو ہاشمیوں کی ایک بڑی جماعت یہ علاقہ چھوڑ کر ہندوستان آگئی۔ ان میں سے جو لوگ ہندوستان کے مغربی ساحل (بالخصوص کونکن کے کنارے) پر آباد ہوئے ان کی اولاد کو نوائت (نوارد) یا نوائط کہتے ہیں اور جو لوگ راس کماری کے مشرق میں آباد ہوئے اور یہاں کی تامل عورتوں سے شادی کرکے ایک مخلوط قوم کے بانی ہوئے انہیں لبّے (Labbas) اور لبابین کہتے ہیں۔ دراس نے بھی دلکس کے حوالے سے لکھا ہے کہ آٹھویں صدی ہجری میں حجاج بن یوسف نے بنو ہاشم کے کچھ لوگوں کو جلا وطن کر دیا۔ ان میں کچھ تو ہندوستان کے مغربی ساحل کوکن میں آکر سکونت پذیر ہو گئے اور کچھ راس کماری کی مشرقی سمت بڑھ گئے۔ اول الذکر کی نسل نوایت اور آخر الذکر کی لبے کہلاتی ہے لبابین کی اکثریت شافعی مسلک کی پیرو ہے۔ نیو کالج کی مسجد آمین بالجہر سے گونجتی اور رفع یدین کا ایسا اجتماعی مظاہرہ ہوتا کہ جس منظر کے ہم اپنے ماحول میں عادی نہیں۔

۲۲ مارچ کو علی الصبح شافعی مسلک کے مطابق غلس میں نماز ادا کی۔ دن میں نو بجے سے انعامی مقابلے کا جلسہ تھا، قرأت، حفظ قرآن مجید، اذان اور تقریر و حدیث کا انعامی مقابلہ، منتظمین کی خواہش تھی کہ میں اس انعامی جلسے میں شرکت کروں، میں خود ان مقابلوں کو دیکھنا چاہتا تھا۔ صبح سے نو بجے تک کا وقت کارآمد بنانے کے لئے میں نے مسجد والاجاہی اور مولانا عبد العلی بحر العلوم فرنگی محلی کے مزار کی زیارت کا پروگرام بنایا۔ مسٹر عبد الحکیم صاحب لیکچرر کیمسٹری ڈپارٹمنٹ نیو کالج کی رفاقت میں اس عظیم الشان مسجد کی زیارت کی، جو اپنی وسعت، سادگی اور دلآویزی میں ممتاز ہے۔

نوابان آرکاٹ اپنی دینداری اور صحیح عقائد میں بڑے ممتاز رہے ہیں ان کی اصلاح اور مدراس کے عوام و خواص میں دینداری اور عقائد صحیحہ کی ترویج و اشاعت

حضرت سید احمد شہیدؒ کے ایک مسترشد کی دینی سید احمد شہیدؒ کے خلفاء میں حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کے علاوہ دو شخصیتیں ایسی تھیں کہ جن کو اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی علم و فضل کے ساتھ شیریں بیانی کی نعمت سے سرفراز کیا تھا۔ یہ دونوں حضرات مولانا عبد الحئیؒ داماد حضرت شاہ عبد العزیز صاحبؒ اور مولانا سید محمد علی واعظ رامپوری تھے۔ ان کے مواعظ اتنے دلچسپ اور ایمان افروز ہوتے تھے کہ لوگ خود بخود ان کی طرف کھنچ کر چلے آتے تھے اور ان کے ہاتھوں پر اپنے گناہوں سے توبہ کر لیتے تھے۔

صاحب نزہۃ الخواطر مولانا حکیم عبد الحئی صاحب حسنی (سابق ناظم ندوۃ العلماء) مولانا محمد علی رامپوری کے حالات یں تحریر فرماتے ہیں:

"الشیخ العالم الکبیر المحدث محمد بن علی بن عنایت علی الحسینی النقوی الدھلوی ثم الرامپوری۔ . . . اخذ الطریقۃ عن السید الامام المجاھد احمد بن عرفان الشہید البریلوی ولازمہ مدۃ من الزمان فاستخلفہ السید ووجھہ الی مدراس فسار الیھا واشتغل بالارشاد والموعظۃ وکان فی تذکیرہ تاثیر عجیب تاب علی یدہ الکریمۃ الوف من الرجال والنساء وانابوا الی اللہ سبحانہ و رفضوا البدع والاھواء۔

(نزہۃ الخواطر ج ، ص۲۵۳)

مولانا سید محمد علی رامپوری ماہ محرم ۱۲۴۵ھ کی ابتداء میں مدراس تشریف لائے نواب نے پرتپاک خیر مقدم کیا۔ ان کے ایک دو وعظ ہوئے تھے کہ ہر طرف سے انہیں وعظ کہنے کے لئے مدعو کیا جانے لگا وہ ہر جگہ نئے انداز سے اتباع کتاب و سنت اور رد شرک و بدعت پر وعظ کہتے۔ بے شمار آدمی ان کی مجلس وعظ میں شریک ہوتے تھے اور ان کے ہاتھ پر اپنے گناہوں سے توبہ کرتے تھے امراء وعمائدین شہر جو رقص و سرود اور لہو و لعب کی محفلوں میں سرمست تھے ان کی وعظ کی مجلسوں میں جب شریک ہوتے تو ان کے مرید ہو جاتے گویوں اور سازندوں نے اپنا پیشہ ترک کر دیا۔

ایک مرتبہ راجہ تکم چند بہادر (جو دربار والاجاہی میں منشی کی خدمت پر مامور تھے) ان کی مجلس وعظ میں شریک ہوئے اور جب سید صاحبؒ کی تقریر زوروں سے ہونے لگی تو انہوں نے اپنے کان بند کر لئے۔ انہوں نے ایسا محسوس کیا کہ گویا دین اسلام کی خوبیاں ان کے کانوں سے ان کے دل و دماغ میں اترتی جا رہی ہیں۔ مدراس کی بہت سی مستورات نے بھی سید صاحب سے بیعت کی ان میں نواب محمد علی والاجاہ مرحوم کی اہلیہ بھی تھیں۔

الغرض سید صاحب کی بدولت مدراس، آرکاٹ، ویلور اور دوسرے مقامات کے بہت سے لوگ غیر شرعی امور سے تائب ہو کر ان کے مرید ہو گئے تھے۔

میں نے ان بندۂ خدا کی اس تبلیغ و دعوت کا نمایاں اثر اپنے قیام مدراس اور سفر آرکاٹ میں محسوس کیا۔ اس پورے علاقے کا دینی و علمی ماحول ایک صدی بعد بھی کسی مردِ درویش کی انفاس قدسیہ کا ثبوت پیش کر رہا تھا۔

ابھی اس راہ سے گذرا ہے کوئی
کہے دیتی ہے شوخی نقش پا کی

مدراس کی مسجد والاجاہی میں دو رکعت نماز تحیۃ المسجد کے بعد میرے ہاتھ دعا کے لئے اٹھے اور بے اختیار زبان سے ان نفوس قدسیہ کی مغفرت اور بلندی درجات کی دعا جاری ہو گئی جنھوں نے صلہ اور ستائش سے بے نیاز ہو کر اس دور دراز علاقے میں اللہ تعالیٰ کی معرفت و محبت کا ذوق اور دین اور علم دین کی اشاعت کا جذبہ پیدا کرنے کے لئے ہر قسم کی مصیبتوں کو برداشت کیا اور دونوں جہاں میں اپنی سرخروئی کا سامان کر گئے۔

مسجد والاجاہی کے محراب پر اس مسجد کی تعمیر کی قطعہ تاریخ کندہ ہے ۔

امیر الہند والاجاہ فرمود
بنائے مسجد فرخندہ اختر
زدل از بہر تاریخ بنائش
ندا آمد کہ ذکر اللہ اکبر
۱۲۰۹ھ

ساخت طاعت کہ اسلام شد دین برادر
آنکہ فرمان براوجت زمرتا باہی
بہتر تاریخ بنائش بخرد ہاتف گفت
نام فرخندہ گوئی مسجد والاجاہی
۱۲۱۰ھ

مسجد کے صحن میں ملک العلماء علامہ عبد العلی بحر العلوم لکھنوی کا مزار ہے۔ دعا و فاتحہ اور ایصال ثواب کی نیت سے میں جب اس قبر پر حاضر ہوا تو میرے دل نے اس گنجینۂ علوم و معارف کی نسبت محسوس کی میں اسی شہر و دیار یعنی لکھنؤ سے حاضر ہوا تھا جو علامہ بحر العلوم کا مرز بوم رہ چکا ہے۔

ملک العلماء علامہ عبد العلی بحر العلوم لکھنؤ کی پیدائش مشہور فرنگی محل خاندان میں ہوئی، آپ نے علوم کی تحصیل اپنے والد ماجد مولانا نظام الدین اور دوسرے باکمال علماء اور اساتذہ سے حاصل کی۔ عرصہ تک لکھنؤ میں درس و تدریس کی خدمت انجام دی اور ایک حادثے کے نتیجے میں انہیں لکھنؤ سے ہجرت کرنا پڑی۔ لکھنؤ سے ہجرت کرکے مولانا بحر العلوم شاہجہاں پور تشریف لے گئے وہاں کے نواب نے ان کا بڑا استقبال کیا، ۲۰ سال انہوں نے وہاں قیام کیا اور نواب عبد اللہ خاں کے انتقال کے بعد رامپور تشریف لے گئے۔ نواب فیض اللہ خاں نے ان کی رامپور تشریف آوری کو اہل رامپور کی خوش بختی پر محمول کیا۔ پھر نواب والاجاہ نواب آرکاٹ کی دعوت پر آپ نے مدراس کا سفر فرمایا اور ۲۲ ذی الحجہ ۱۲۰۵ھ کو مدراس تشریف فرما ہوئے۔ نواب والاجاہ نے آپ کا زبردست استقبال کیا اور اپنے محل میں ٹھہرایا۔ نواب محمد علی والاجاہ نے مولانا عبد العلی کی گراں قدر تنخواہ مقرر فرمائی، آپ اپنی قیام گاہ پر شوقین طلباء کو پڑھایا کرتے تھے اس طرح خود بخود سرکاری مدرسے کی صورت پیدا ہو گئی جس کو مسجد والاجاہی کے مشہور نام مسجد کلاں کی مناسبت سے "مدرسہ کلاں" کہا جانے لگا۔

جب ۱۲۱۰ھ میں نواب محمد علی والاجاہ کا انتقال ہوا اور نواب عمدۃ الامراء بہادر سریر آرائے سلطنت ہوئے تو انہوں نے مولانا عبد العلی بحر العلوم کو ملک العلماء کا خطاب دیا۔ آپ کا انتقال ۱۲ رجب ۱۲۲۵ھ کو مدراس میں ہوا اور مسجد والاجاہی میں تدفین ہوئی۔ مزار پر یہ کتبہ کندہ ہے۔

حضرت مولانا ملک العلماء بحر العلوم عبد العلی قدس سرہ ۱۲ رجب ۱۲۲۵ھ
قطعہ تاریخ رحلت حضرت مولانا

کی العلماء بحر العلوم عبد العلی رحمۃ اللہ علیہ
تلامیذ اسرار دل ہیں حضرت بحر العلوم
چند بحر ہیں بے مسلم عظمت بحر العلوم
کر مکتوب جبارک ہے جو شرح مثنوی
ہے انوکھی یادگار حضرت بحر العلوم
کیا شریعت کیا طریقت کیا عرفان حق
سب میں یکتائے زماں حضرت بحر العلوم
آپ نے وہ فیض بخشا صوبہ مدراس کو
ذرہ ذرہ ہے رہین منت بحر العلوم
مرقد پاک آپ کا ہے جلوہ گاہ خاص و عام
سب کے دل میں جاگزیں ہے الفت بحر العلوم
اور سر طیبہ کو مشرقی یہ تاریخ وصال
اب جہاں سے ہو چکی ہے رحلت بحر العلوم

۱۲۲۵ھ

(عقیدت کیش محمد عبد اللہ شرقی)

مسجد والا جاہی کے صحن میں اور بھی کئی ایسی قبریں تھیں جن کے کتبات کو پڑھ کر مجھے ان کے مقام و مرتبہ کا اندازہ ہوا اور دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ نگاہوں کے سامنے پھر گیا۔ داخلی دروازہ کے پاس ہی ایک سادہ مگر خوبصورت قبر کے کتبہ پر نظر پڑی۔

افضل العلماء ڈاکٹر عبد الحق صاحب مرحوم
(سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ و عربک کالج مدراس)

پروفیسر رشید احمد صدیقی کی کتاب ہم نفسان رفتہ مطالعہ میں نظر سے گذری تھی مختلف مرحوم شخصیتوں کے اس قلمی مرقع میں افضل العلماء ڈاکٹر عبد الحق مرحوم ... خاکہ ذہن و دماغ پر انمٹ نقوش چھوڑ گیا۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی کے منفرد و دلکش اسلوب میں افضل العلماء ڈاکٹر عبد الحق مرحوم کی پاکیزہ جامع تعلیقی و متوازن خیال و شخصیت کا قلمی مرقع بار بار پڑھنے کی ... وقت و اثر میں اضافہ ہی ہوتا گیا۔ رشید صاحب نے اپنے مضمون کا آغاز ایک ایسے واقعہ سے کیا جو ہم ہندوستانی مسلمانوں کے لئے آج بھی دعوت عمل دیتا ہے لکھتے ہیں۔

"مدراس کے ریلوے اسٹیشن پر ایک اجنبی مسلمان اس فکر میں مضطرب پھر رہا تھا کہ رات بسر کرنے کے لئے کوئی جگہ مل جائے۔ اسٹیشن کے چھوٹے بڑے اہل کار کسی دلچسپی سے اس کی طرف متوجہ نہ ہوئے اتنے میں ایک طرف سے ایک چھریرے جوان کو دیکھا جنہوں نے اس کی پریشانی دیکھ کر قریب آیا وجہ دریافت کی صورت حال معلوم ہونے پر اسے ایک جگہ اطمینان سے بٹھا کر چلے گئے اور تھوڑی دیر کے بعد ... کا بندوبست کر کے آئے ... ابھی ہو ... ہی سے دو تین روز کی ... مدت ... بالآخر

واپس آیا اور مسلمان کو مطلوبہ جگہ پر پہونچا دیا۔ مسلمان نے حیرت اور شکر گذاری کے ساتھ ہندو دوست سے متعارف ہونا چاہا تو پتہ چلا اصرار کے بعد اس نے بتایا کہ پراگ نماز سے آدم و افلاس کا گذرا ہے نہ کوئی سہارا دینے والا اعتبار دلاسا، اس مایوسی اور بے بسی کے عالم میں ڈاکٹر عبد الحق کی خدمت میں پہونچا اور اپنی مصیبت بیان کی سب کام چھوڑ کر بڑی شفقت سے پیش آئے، امید بندھائی اور روزگار کا ایسا بندوبست کر دیا کہ میری زندگی کی کایا پلٹ گئی، میں نے ان کے احسان کو اس طرح محسوس کیا جیسے مجھ میں بڑی اچھی صلاحیتیں ابھر آئی ہوں اور مایوسی و بیزاری سے ہمیشہ کے لئے چھٹکارا مل گیا ہو۔

پھر میں نے عہد کیا کہ جب تک جیوں گا جس مسلمان کو تکلیف اور تردد میں دیکھوں گا حتی الوسع اس کی مدد کروں گا۔

یہ تھے مرحوم ڈاکٹر عبد الحق
صوفی منش اور سراپا شفقت۔

رشید صاحب آگے لکھتے ہیں۔

"عبد الحق صاحب کو ذاکر صاحب (ڈاکٹر ذاکر حسین اس دور کے وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور بعد کے صدر جمہوریہ ہند) یہاں کی پرو وائس چانسلری پر بڑے اصرار و اشتیاق سے لائے تھے ...... اسی دور میں یونیورسٹی بڑے نازک دور سے گذر رہی تھی ...... ذاکر صاحب یہاں کے در و بست پر حاوی نہیں ہو پائے تھے کہ بیمار ہو گئے، طویل علالت کے بعد صحت بحال ہوئی تو امریکہ جانا پڑا، عبد الحق صاحب نے وائس چانسلری کا کام سنبھالا ......

...... لوگوں نے دیکھا کہ شکل و صورت وضع قطع، رہن سہن شرعی مسلمانوں جیسی ترکی ٹوپی سر پر، داڑھی، ٹخنگا پاجامہ، پان، کھانا، مصافحہ کرنا، جو جہاں ملا بے تکلف چلے جانا ......

بات یہ پھیلی کہ ڈاکٹر عبد الحق تو قال اللہ و قال الرسول قسم کے مولوی علی گڑھ کو کیا جانیں اور ماڈرن یونیورسٹی کے طور طریق کو کیا سمجھیں ......

...... مگر فضا کچھ اس طرح بدلنے لگی کہ وہ لوگ جو اسلامی روایات کو قصہ ماضی سمجھتے تھے ڈاکٹر صاحب کی ذات میں ان اقدار و روایات کو ناقابل تسخیر سمجھنے لگے یہاں تک کہ جن نے مجھے طرز عمل پر جیا پہنچائی

کیا اور معافی کے خواستگار ہوئے۔

...... فرمائش کی گئی کہ اسٹریچی ہال میں ڈاکٹر صاحب انگریزی میں تقریر فرمائیں۔ موضوع بحث کچھ اس طرح تھا کیا فقہ اسلامی رومن لاء سے ماخوذ ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے تین لیکچر دئے اسٹریچی ہال حاضرین سے لبریز ہوتا، بغیر کسی یادداشت کے سہل اور شستہ انگریزی میں بے تکلف تقریر کرتے، کتنی مدلل، پر مغز اور فکر انگیز وہ تقریریں تھیں۔

ڈاکٹر صاحب نے ایسے گھرانے میں آنکھ کھولی جہاں علم اور دین کا چرچا تھا، اس عہد میں علم کا سرچشمہ دین تھا اور دین کا مقصد خدا کی اطاعت اور خلق کی خدمت ہے۔

ڈاکٹر عبد الحق نے بحیثیت انسان اور مسلمان مجھے غیر معمولی طور پر متاثر کیا ہے ...... ڈاکٹر صاحب عربی، فارسی کے عالم متبحر، اردو شعر و ادب کے شیدائی اور انگریزی اور اردو کے بڑے اچھے مقرر تھے، ان کی تقریریں دلنشیں، بے تکلف اور پُر مغز ہوتی تھیں، ان کا مطالعہ اتنا وسیع معلومات اتنی متنوع، ذہن اس درجہ رسا اور طبیعت ایسی شائستہ اور شگفتہ تھی کہ وہ کسی موضوع پر برجستہ بھی تقریر کرتے تو ایسا معلوم ہوتا جیسے یہ موضوع ان کے مدتوں کے مطالعہ کا نتیجہ تھا، اردو یا انگریزی میں گفتگو یا تقریر کرتے تو لب و لہجہ سے ظاہر ہوتا جیسے انہوں نے تمام عمر مدراس اور اس کے نواح میں نہیں، بلکہ دہلی، لکھنؤ یا اس کے آس پاس بسر کی تھی۔

......

ڈاکٹر صاحب نے علی گڑھ میں کم و بیش چھ ماہ قیام کر کے ہمارے دلوں میں اپنے لئے اتنے پاکیزہ اور قابل احترام خیالات و جذبات پیدا کر لئے جو اتنی کم مدت میں علی گڑھ میں آج تک کوئی اور نہ پیدا کر سکا۔

کسی آدمی کے بڑے ہونے کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ اسکو غریبوں اور بچوں سے کتنی محبت ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو ان دونوں سے بڑا شغف تھا، صاحبزادی کی شادی کی تو اسی دن اور اسی وقت بستی کی سات غریب لڑکیوں کی شادی کرائی، ہر طرح مالی امداد پہونچائی اور ان کی برابر خبر گیری کرتے رہے۔

جنوب کے اس عظیم انسان پر شمال کے ایک ممتاز اہل قلم کے یہ اعتراف و ستائش کے اقتباسات اس خیال سے میں نے دئے کہ افضل العلماء ڈاکٹر عبد الحق مرحوم قدیم و جدید، عالم و مفکر، دین و دنیا، جامع شریعت و سنت اور عاشق کا وہ مثالی نمونہ تھے جن کے حالات پڑھ کر ہر شخص نفع اٹھا سکتا ہے، اور نفع پہونچا سکتا ہے۔

ایک جگہ ڈاکٹر صاحب کے تذکرہ میں پروفیسر رشید احمد صدیقی نے لکھا ہے کہ

"مجھے جو شخص یا شئی اچھا نظر آتا ہے جی چاہنے لگتا ہے کہ وہ علی گڑھ کا ہو جائے"

مگر ڈاکٹر صاحب کی صفات و خصوصیات پڑھ کر مجھے ڈاکٹر صاحب مرحوم ندوہ کے مکتبہ فکر اور قدیم صالح و جدید نافع کا امتزاج نظر آئے اور جی یہ چاہا کہ کاش! ڈاکٹر صاحب ندوی ہوتے ان سے اسی عقیدت و محبت اور ذہنی و فکری ہم آہنگی نے ان کا عقیدت مند بنا دیا تھا۔ اور آج جب میں ان کی ابدی آرام گاہ پر حاضر ہوا تو اس محبوب شخصیت سے اظہار عقیدت و محبت کا بجز اس کے اور کوئی بہتر ذریعہ نہیں تھا کہ میں ان کے لئے دعائے مغفرت اور بلندی درجات کروں۔ میں نے قرآن مجید کی چند سورتیں پڑھ کر انہیں ایصال ثواب پہونچایا۔

ڈاکٹر صاحب کی زیارت و ملاقات کی سعادت مجھے نصیب نہیں ہوئی اور اب اس دنیا میں ان سے ملاقات کا کوئی امکان بھی نہیں ہے

"خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہو گئیں"

(جاری)

ضروری اعلان!

جن خریداروں کا زر سالانہ ختم ہو گیا ہے وہ براہ کرم زر مبادلہ بذریعہ منی آرڈر روانہ کریں، ورنہ وی۔ پی کے مزید مصارف ادا کرنے پڑیں گے۔ اور دفتر کو بھی دشواری ہوگی۔

(منیجر)